مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۰ | ربیع الثانی سنہ ۱۴۴۰ھ | جنوری ۲۰۱۹ء | شمارہ ۱

ذم النسیان

ذکر اللہ سے غفلت کی برائی

ازافادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے | زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور
35422213
35433049

پتہ دفتر
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس

۱۳/۲۰ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت

جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

ذم النسیان
(ذکر اللہ سے غفلت کی برائی)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	خطبۂ ماثورہ.....	۹
۲.....	قرآن پاک کا ہر جزء ضروری ہے.....	۹
۳.....	مستحبات کی تعلیم بھی ضروری ہے.....	۱۰
۴.....	عاشق کا مذاق.....	۱۰
۵.....	حق تعالیٰ شانہ سے محبت اور جانثاری کا تعلق.....	۱۱
۶.....	حق تعالیٰ شانہ سے ہمارا تعلق انتہائی ضعیف ہے.....	۱۲
۷.....	ضابطہ کے تعلق سے لطف حاصل نہیں ہوتا.....	۱۳
۸.....	تعلق کا بقاء استحکام پر موقوف ہے.....	۱۴
۹.....	اللہ تعالیٰ سے نفس تعلق بھی نعمت ہے.....	۱۴
۱۰.....	ضعف تعلق پر قناعت کرنا ظلم ہے.....	۱۴
۱۱.....	اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق عمل کی ضرورت.....	۱۵
۱۲.....	طلب راحت اور سستی میں فرق.....	۱۶
۱۳.....	مستحبات کے ثمرات.....	۱۷
۱۴.....	لفظ اللہ اعرف المعارف ہے.....	۱۷
۱۵.....	بلی پر ترس کھانے سے نجات.....	۱۸
۱۶.....	مستحبات میں عنایات و برکات.....	۱۹
۱۷.....	واقعات رحم سننے کے دو اثر.....	۱۹

۱۸.....	غزوہ احد میں حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اجتہادی غلطی.....	۲۰
۱۹.....	حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے.....	۲۳
۲۰.....	وعظ میں سامعین کی ضرورت کا اہتمام.....	۲۴
۲۱.....	بدحالی کا سہل علاج.....	۲۵
۲۲.....	کثرت گناہ کا اثر.....	۲۷
۲۳.....	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باریک بینی.....	۲۷
۲۴.....	طاعات میں اعتدال کی عجیب مثال.....	۲۸
۲۵.....	خوف کا اعتدال.....	۲۸
۲۶.....	یونانی حکماء کی ایک غلطی.....	۳۰
۲۷.....	گناہوں کی کثرت مایوسی کا باعث بن جاتی ہے.....	۳۱
۲۸.....	تسلی شیخ کے بعد پریشان ہونا برا ہے.....	۳۱
۲۹.....	آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ثقل وحی کی کیفیت.....	۳۲
۳۰.....	قبض میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال.....	۳۳
۳۱.....	قبض میں مصلحت.....	۳۴
۳۲.....	سالک کا حال.....	۳۴
۳۳.....	یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے؟.....	۳۵
۳۴.....	خود کو حقیر سمجھنے کی صورتیں.....	۳۵
۳۵.....	حجاب کی دو قسمیں.....	۳۶
۳۶.....	بعض اہل اللہ کا حال.....	۳۷
۳۷.....	اصل مقصد دل کا رونا ہے.....	۳۹

۳۸.....	معذور حضرات صاحب کمال نہیں ہوتے	۴۰
۳۹.....	حضرت جنیدؒ ایک صاحب کمال بزرگ	۴۰
۴۰.....	بعض اکمل صحابہؓ کا حال	۴۱
۴۱.....	وصال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خطبہ صدیق اکبرؓ	۴۲
۴۲.....	حضرت صدیق اکبرؓ کا ایک عجیب واقعہ استقلال	۴۳
۴۳.....	اللہ تعالیٰ کو بھول جانا مسلمانوں کی محبت سے بعید ہے	۴۷
۴۴.....	مسلمان کبھی کافر نہیں ہوسکتا	۴۸
۴۵.....	ایک عجیب عبرت انگریز حکایت	۴۸
۴۶.....	عجب و پندار کے لیے مردودیت لازم ہے	۵۱
۴۷.....	ایمان کی حالت	۵۱
۴۸.....	بعض صاحب حال کا حال	۵۲
۴۹.....	اہل نیاز کو ناز زیبا نہیں	۵۳
۵۰.....	اللہ تعالیٰ کو بھول جانا کافر کا کام ہے	۵۴
۵۱.....	خودکشی کے حرام ہونے کا راز	۵۵
۵۲.....	لذائذ کے استعمال میں عارفین کی نیت	۵۶
۵۳.....	محبوب کی طرف بری باتوں کی نسبت کرنا بے ادبی ہے	۵۷
۵۴.....	اہل اللہ کی خدمت میں بیٹھنے کا ادب	۵۸
۵۵.....	حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رتبہ	۵۹
۵۶.....	ہماری بدحالی کا سبب	۶۰
۵۷.....	مرض نسیان کا علاج ذکر اللہ ہے	۶۱
۵۸.....	اللہ کی یاد کے متعدد طرق	۶۲

۵۹.....	حق تعالیٰ شانہ کے ارشاد فرمودہ سب طریقے بڑھیا ہیں.....	۶۳
۶۰.....	طلب جنت کی متعدد نیتیں.....	۶۴
۶۱.....	یاد کی اقسام.....	۶۷
۶۲.....	سرکاری تقسیم.....	۶۷
۶۳.....	کیفیات ومقامات کی تمنا خلاف عبدیت ہے.....	۶۹
۶۴.....	گناہوں سے بچنے کی آسان تدبیر.....	۷۰
۶۵.....	پابندی ذکر کی برکات.....	۷۱
۶۶.....	خلاصہ وعظ.....	۷۲
۶۷.....	اخبار الجامعۃ.....	۷۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وعظ

ذم النسیان
(ذکر اللہ سے غفلت کی برائی)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے یہ وعظ ۱۷ ربیع الاول ۱۳۳۱ ہجری بعد نماز عشاء بمقام جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ۲ گھنٹہ ۱۸ منٹ ارشاد فرمایا۔ موضوع تھا گناہوں کا سبب یاد الٰہی سے غفلت ہے اس کی برائی بیان کر کے علاج بتلایا کہ ذکر اللہ میں مشغول ہونا اس کا علاج ہے۔ ایک وقت مقرر کر کے اللہ کے انعامات کی سوچے اور ذکر میں مشغول ہو تو گناہ چھوٹ جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو حسب توفیق مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی
۸/۱۰/۲۰۱۸

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد انّ سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ و رسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ و علیٰ اٰلہ و اصحابہ و بارك و سلم۔

اما بعد:

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

{وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ}(۱)

قرآن پاک کا ہر جزء ضروری ہے

یہ ایک مختصر سی آیت ہے۔ سورہ حشر کے آخر کی جس میں مثل دوسری آیتوں کے ایک نہایت ضروری مضمون مذکور ہے اور میں نے تشبیہ کا صیغہ اس لیے استعمال کر دیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ یہ کچھ اسی آیت کی تخصیص نہیں بلکہ قرآن کی تمام آیات کی یہی شان ہے کہ ہر آیت میں ضروری ہی مضمون ہے اگر میں تشبیہ کا ذکر نہ کرتا تو ممکن تھا کسی کو یہ شبہ ہوتا کہ شاید دوسری آیتوں میں ضروری مضمون نہیں۔ بس خاص اسی آیت میں یہ بات ہے۔ گو اس شبہ کی کوئی معقول وجہ نہ تھی کیونکہ تخصیص ذکری سے تخصیص حکمی (۲) لازم نہیں آتی مگر شاید کسی کو بلاوجہ ہی شبہ پڑتا اس لیے میں نے تشبیہ کے صیغہ سے پہلے ہی دفع دخل مقدر (۳) کر دیا کہ اس آیت میں بھی ایک نہایت ضروری مضمون ہے جیسا کہ دوسری آیتوں کی بھی یہی شان ہے۔ قرآن کا تو ہر ہر جز وضروری ہے اس میں غیر ضروری کوئی بات بھی نہیں ہے۔

(۱) ''اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے اللہ سے بے پروائی کی تو اللہ تعالیٰ نے خود ان کی جان سے ان کو بے پرواہ بنا دیا، یہی لوگ نافرمان ہیں'' الحشر:۱۹ (۲) کسی بات کو خصوصیت سے ذکر کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ حکم اسی کے ساتھ خاص ہے (۳) میں نے اعتراض سے قبل ہی اس کا جواب دیدیا ہے۔

مستحبات کی تعلیم بھی ضروری ہے

حتیٰ کہ جن آیات میں واجبات وفرائض کا بھی ذکر نہیں محض مستحبات ہی کا ذکر ہے۔ مضمون ان کا بھی ضروری ہے۔ گو آج کل مستحبات کو ضروری نہیں سمجھا جاتا اور عمل کے درجے میں وہ واجبات وفرائض کے برابر ضروری ہیں بھی نہیں، مگر تعلیم ان کی بھی ضروری ہے دو وجہ سے، ایک اس لیے کہ لوگوں کو ان کا مستحب ہونا معلوم ہوجائے گا تو کوئی ان کو ناجائز نہ سمجھے گا یا فرض وواجب نہ خیال کرے گا یہ تو اصلاح اعتقاد کے لحاظ سے ضروری ہے اور اس درجے میں مباحات (۱) کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ دوسرے اس لیے کہ ان کی برکات اور ثمرات بے شمار ہیں (۲) جن پر مطلع نہ ہونا ہی ان سے بے رغبتی کا باعث ہے (۳) اگر ان برکات وثمرات کی اطلاع ہوجائے جو ادنیٰ ادنیٰ مستحبات (۴) سے حاصل ہوتے ہیں تو آپ خود کہیں گے کہ افسوس ہم اب تک بڑے خسارہ میں تھے جو ایسے قیمتی جواہرات سے بے خبر رہے (یہ ضرورت تکمیل عمل کے درجے میں ہے) غرض مستحبات کا ذکر بھی قرآن میں بے ضرورت نہیں بلکہ تعلیم کے درجے میں ان کا ذکر بھی ضروری اور بہت ضروری ہے اگر محبت ہو تو اس کی قدر ہو۔

عاشق کا مذاق

عاشق کا مذاق یہ ہوتا ہے کہ وہ محبوب کی خوشی کی ذرا ذرا سی بات کی تلاش میں رہتا ہے اور جب اس کو معلوم ہوجاتا ہے کہ محبوب فلاں فلاں بات سے خوش ہوتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ بھی کرلوں وہ بھی کرلوں اور کوئی بات اس کے خوش کرنے کی مجھ سے رہ نہ جائے۔ اگر ہم لوگوں کو یہ مذاق عاشقانہ نصیب ہوجائے تو اس وقت ان مستحبات کی قدر معلوم ہو اور ان کے بیان کو خداوند تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت سمجھیں گے کہ اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس تفصیل سے ان باتوں کو بتلادیا جو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والی ہیں اور اگر شریعت میں صرف ضروریات ہی

(۱) ایسے کام جنکا کرنا جائز ہے (۲) نفلی اور مستحب کاموں کا فائدہ بہت ہے (۳) آدمی کو چونکہ ان کا نفع معلوم نہیں اس لیے ان کے کرنے کا شوق بھی نہیں (۴) چھوٹے چھوٹے مستحب کاموں سے۔

کا بیان ہوتا مستحبات کا ذکر نہ ہوتا تو عشاق کو سخت بے چینی ہوتی کیونکہ قاعدہ ہے کہ عاشق محض ضروریات پر اکتفا نہیں کیا کرتا ان کو تو وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے(۱) بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ فرض منصبی کے علاوہ بھی میں کچھ ایسا کام کروں جس سے محبوب کو مجھ پر زیادہ توجہ ہو۔ دیکھئے ایک نوکر تو وہ ہے جو محض تنخواہ کے لیے کسی خاص کام پر آپ کا ملازم ہے۔ وہ تو یہ چاہے گا کہ فرض منصبی کو ادا کرتا رہوں۔ اس سے زیادہ کی اس کو خواہش نہ ہوگی اور ایک وہ نوکر ہے جس کو بچپن سے آپ نے پالا، پرورش کی ہے اور اس کو آپ کے ساتھ جاں نثاری کا تعلق ہے وہ ہرگز فرضِ منصبی پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ وہ اس کی کوشش کرے گا کہ آقا کے خوش کرنے کا جو کام بھی ہو وہ میرے ہاتھ سے ہوجائے۔ وہ اپنے خاص کام کے علاوہ رات کو آپ کے پیر بھی دبائے گا، پنکھا بھی جھلے گا اور آپ کے جاگنے سے پہلے تمام ضروریات مہیا کرنے کا سامان کرے گا اور یہ کبھی خیال نہ کرے گا کہ یہ کام تو میرے فرض منصبی (۲) سے زیادہ ہیں انہیں کیوں کروں بلکہ اس کی محبت اور جاں نثاری مجبور کرے گی کہ جس کام سے بھی آقا خوش ہو وہ ضروری کرنا چاہیے۔

حق تعالیٰ شانہ سے محبت اور جانثاری کا تعلق

صاحبو! ہمارا علاقہ (۳) حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ ہمارے خیال فاسد (۴) میں محض قانونی رہ گیا ہے اسی لیے ہم واجبات وفرائض کے علاوہ مستحبات کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اگر ہم کو حق تعالیٰ کے ساتھ محبت اور جاں نثاری کا علاقہ ہوتا تو فرائض وواجبات پر ہم کبھی اکتفا نہ کرسکتے بلکہ مستحبات کی تلاش میں خود بخود رہتے اور جس بات کے متعلق بھی یہ معلوم ہوجاتا کہ حق تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اس کی طرف شوق سے سبقت (۵) کرتے اور جس بات کے متعلق یہ معلوم ہوجاتا کہ یہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہے اس سے کوسوں (۶) دور بھاگتے اور اس کی تحقیق نہ کرتے کہ یہ زیادہ ناپسند ہے یا کم۔ عاشق کو اتنا جان لینا کسی کام سے روکنے کے لیے کافی ہے کہ یہ محبوب کو ناپسند

(۱) اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے (۲) میری ذمہ داریوں میں شامل نہیں (۳) تعلق (۴) بے ہودہ خیال (۵) بڑھتے (۶) میلوں۔

ہے وہ کبھی تفتیش (۱) نہیں کرتا کہ یہ ایسا ناپسند ہے کہ اس کی سزا میں ضرب وحبس (۲) کی جاتی ہے یا ایسا ناپسند ہے کہ محبوب کسی قدر کبیدہ (۳) خاطر ہوجاتا ہے اور رخ پھیر لیتا ہے اس کے نزدیک دونوں کام برابر ہیں وہ اس کو بھی ہرگز گوارا نہیں کرسکتا کہ محبوب اس سے کچھ بھی کبیدہ خاطر یا بے رخ ہوجائے (۴) اور جس کام میں کبیدگی کے علاوہ سزائے ضرب وحبس بھی ہو (۵) وہ تو بھلا کیوں ہی کرنے لگا۔

حق تعالیٰ شانہ سے ہمارا تعلق انتہائی ضعیف ہے

مگر آج کل ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کسی کام کی نسبت یہ معلوم ہوجائے کہ یہ گناہ ہے تو سوال ہوتا ہے کہ کیا بڑا گناہ ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر چھوٹا گناہ ہو تو کرلیں گے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ بہت ضعیف ہوگیا ہے۔ گو پوری بے تعلقی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ سوال ہی تعلق کی دلیل ہے میں ان لوگوں کی طرف داری کرتا ہوں کہ ان کو خدا تعالیٰ سے بالکل بے تعلق نہ سمجھا جائے کیونکہ ان کو اتنا تعلق تو ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو زیادہ ناراض کرنا پسند نہیں کرتے اگر اتنا بھی تعلق نہ ہوتا تو اس سوال ہی کی کیا ضرورت تھی کہ یہ کیا بڑا گناہ ہے۔ معلوم ہوا کہ بڑے گناہ سے ڈرتے ہیں کیونکہ اس سے خدا تعالیٰ بہت ناراض ہوتے ہیں لیکن زیادہ تعلق نہیں ہے اس لیے تھوڑا سا ناراض کردینا گوارا ہے۔ غرض یہی سوال تعلق کی بھی دلیل ہے اور ضعف تعلق کی بھی اس تقریر سے وہ لوگ خوش ہوئے ہوں گے جو گناہ کے متعلق بڑا چھوٹا ہونے کا سوال کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق بھی ثابت ہوگیا اور یہ بات ایک درجہ میں ہے بھی خوش ہونے کی، کیونکہ

بلا بودے اگر ایں ہم نبودے (۶)

مگر وہ یاد رکھیں کہ نفس تعلق پر قناعت (۷) نہیں ہوسکتی آخر آپس میں جو ایک دوسرے سے ہم تعلقات رکھتے ہیں کیا ان میں نفس تعلق پر کوئی شخص قناعت کرسکتا ہے ہرگز نہیں بلکہ ہر

(۱) تحقیق (۲) آدمی کو قید کرکے پٹائی کی جاتی ہے (۳) رنجیدہ دل (۴) محبوب کا دل دکھے اور وہ اس سے منہ پھیرلے (۵) جس کام میں ناپسندیدگی کے ساتھ قید وپٹائی بھی ہو (۶) مصیبت ہوتی اگر یہ بھی نہ ہوتا (۷) صرف تعلق ہونے پر اکتفاء نہیں کیا جاسکتا۔

تعلق کا درجہ کمال ہر شخص کو مطلوب ہے۔

ضابطہ کے تعلق سے لطف حاصل نہیں ہوتا

دیکھئے بیوی کے ساتھ جو ارتباط ہے(۱) حالانکہ وہ ایک نہایت ہی ضعیف تعلق ہے جو صرف دو لفظوں سے جڑ جاتا ہے اور ایک لفظ سے ٹوٹ جاتا ہے مگر اس میں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا جو نفس تعلق پر قناعت کرتا ہو بلکہ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بیوی کو میرے ساتھ کامل تعلق ہو اسی لیے محض حقوق ضروریہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے خوش کرنے کے لیے وہ کام کیے جاتے ہیں اور وہ زیور اور لباس تیار کیے جاتے ہیں جو اس کا حق نہیں مگر محض اپنے مصالح(۲) کی وجہ سے ان کاموں کو کیا جاتا ہے تاکہ یہ تعلق بڑھے اور مستحکم ہو۔ اگر مرد بیوی کے ساتھ یا بیوی مرد کے ساتھ قانونی علاقہ رکھے اور حقوق ضروریہ سے زیادہ کچھ نہ کرے تو گو نفس تعلق باقی رہ سکتا ہے مگر تعلق کا لطف حاصل نہیں ہوتا اور اس صورت میں ہر وقت قطع(۳) تعلق کا اندیشہ رہتا ہے۔ تعلق کو بقاء جب ہی ہوتی ہے کہ اس کے استحکام کی تدبیر کی جائے۔ چنانچہ مرد کے ذمہ بیوی کا محض کھانا کپڑا ضروری ہے۔ زیور اور ریشمی لباس لازم نہیں نہ اس کی دوا دارو لازم ہے نہ اس کے کنبے والوں کی دعوت ضیافت ضروری ہے مگر محض تعلق بڑھانے کے لیے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے اور اس کے جی خوش کرنے کو ہر کام میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ تعلق نہایت ہی ضعیف ہے مگر باوجود اس ضعف کے اس کا منقطع ہو جانا ہر شخص کو ناگوار ہے اور اگر کبھی منقطع ہو جاتا ہے تو کتنا رنج ہوتا ہے اور انقطاع(۴) سے بچنے ہی کے لیے اس کے استحکام کے اسباب اختیار کیے جاتے ہیں پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہم کو ایک ضعیف تعلق میں تو نفس تعلق پر قناعت نہ ہو بلکہ خوف انقطاع(۵) سے اس کے استحکام کی فکر(۶) ہو اور حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق پر اکتفا گوارا ہو حالانکہ خدا تعالیٰ

(۱) تعلق (۲) اپنی مصلحتوں کی بنا پر (۳) تعلق ٹوٹنے کا خوف رہتا ہے (۴) ٹوٹنے (۵) ٹوٹنے کے خوف سے (۶) مضبوط کرنے کی فکر۔

سے ہمارا ایسا قوی علاقہ ہے کہ اس کے برابر کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ استحکام کی ہم کو فکر نہیں اور محض نفس تعلق کو کافی سمجھ رکھا ہے اور یہاں وہ خیال کیوں نہیں کیا جاتا۔

تعلق کا بقا استحکام پر موقوف ہے

تعلق کا بقا استحکام پر موقوف ہے۔ نفس تعلق بقا کے لیے کافی نہیں بلکہ اس میں زوال و انقطاع کا خطرہ لگا ہوا ہے(۱) تو کیا کوئی اس بات کو گوارا کرسکتا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جو اس کا علاقہ ہے وہ منقطع ہوجائے، ہرگز نہیں! پھر اس کے استحکام کا کیوں خیال نہیں کیا جاتا۔

مولانا فرماتے ہیں:

ایکہ صبرت نیست از فرزند وزن صبر چوں داری زرب ذوالمنن
ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں صبرے چوں داری زنعم الماہدون(۲)

اللہ تعالیٰ سے نفس تعلق بھی نعمت ہے

ہائے ہمیں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تو صبر نہیں ہوسکتا مگر نہ معلوم خدا تعالیٰ سے لوگوں کو کیسے صبر آ گیا۔ ادنیٰ، ادنیٰ چیزوں کے ساتھ ضعف تعلق ہم کو گوارا نہیں اور خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق ضعیف ہونے پر(۳) ذرا جی نہیں دکھتا۔ پس گو حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق بھی ایک نعمت ہے۔ مگر ضعف تعلق پر قناعت کر لینا بھی بڑا ظلم ہے۔ بعض لوگ تو بے تعلقی ہی پر راضی ہیں یہ تو کفار ہیں ان سے اس وقت خطاب نہیں اور بعض لوگ ضعف تعلق پر راضی ہیں یہ ہم آج کل کے مسلمان ہیں۔ حیرت ہے کہ ہم کو خدا تعالیٰ کے ساتھ ضعف تعلق رکھنے پر صبر کیسے آتا ہے اسی کا یہ اثر ہے کہ آج کل ہم کو مستحب کی خبر نہیں اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔

ضعف تعلق پر قناعت کرنا ظلم ہے

میں اپنی کہتا ہوں کہ بچپن میں بہت سے نوافل کا پابند تھا مگر منیۃ المصلی پڑھتے

(۱) تعلق ٹوٹنے اور زائل ہونے کا اندیشہ ہے (۲) ''اے شخص بیوی بچوں سے تجھ کو صبر نہیں ہے خدا تعالیٰ سے تجھ کو صبر کیونکر آ گیا، حقیر اور ذلیل دنیا سے تجھ کو صبر نہیں ہے تو حق تعالیٰ شانہ سے تو نے کیونکر صبر کر لیا'' (۳) تعلق کمزور ہونے پر۔

ہی جب معلوم ہوا کہ یہ تو مستحبات ہیں جن کے نہ کرنے میں کچھ گناہ نہیں اسی وقت سے نوافل کو چھوڑ دیا۔ اس وقت تو متنبہ نہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالت بری تھی۔ اس کا تو یہی حاصل ہوا کہ ہم حق تعالیٰ کے ساتھ ضابطہ کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں کہ ضروریات کو بجالائیں اور ان کے علاوہ جو باتیں خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کی ہیں ان کو نہ بجالائیں تو کیا ہم دنیا میں اپنے مربیوں کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کر سکتے ہیں کہ خدمت واجبہ کے سوا کچھ نہ کریں، ہرگز نہیں۔ دیکھئے بعض اوقات کسی طمع (۱) کی وجہ سے یا محبت کی وجہ سے ہم اپنے مربیوں کی خدمت غیر واجبہ بھی کچھ کرتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کا اتنا بھی حق نہیں جتنا مربیوں اور بزرگوں کا حق ہوا کرتا ہے۔ ذرا کچھ تو انصاف سے کام لینا چاہیے پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی اطاعت میں اسی قدر اکتفا کرتے ہیں جو فرض وواجب ہے اور طاعت غیر واجبہ کو کسی درجے میں بھی ضروری نہیں سمجھتے یہ ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ کی شان کے لائق ہم سے اس کی طاعت کا حق ادا نہیں ہوسکتا اور ہم جتنا بھی کچھ کریں وہ اس کے حق میں کوتاہی ہے کیونکہ اس سے ہم کو یہ دھوکہ ہوگیا ہے کہ جب حق ادا ہو ہی نہیں سکتا تو پھر کس لیے زیادہ کوشش کریں مگر یہ سخت غلطی ہے۔

اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق عمل کی ضرورت

اس میں شک نہیں کہ ہم اس کی شان کے موافق عمل نہیں کر سکتے مگر اپنے مقتضائے حال کے موافق تو کر سکتے ہیں۔ (دنیا میں رات دن دیکھا جاتا ہے کہ لوگ سلاطین (۲) کے سامنے ہدایا وتحائف لے جاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ بادشاہ کی شان کے موافق ہمارا ہدیہ نہیں ہوسکتا مگر اس کا یہ اثر کبھی نہیں ہوتا کہ ہدیہ دینا ہی موقوف کر دیں بلکہ جتنا اپنے سے بن پڑتا ہے (۳) کوشش کر کے عمدہ سے عمدہ ہدیہ پیش ہی کرتے ہیں اسی لیے مثل مشہور ہے کہ ہدیہ تو دوسرے کی شان کے موافق ہو یا کم از کم اپنی ہی شان کے موافق ہو) پس ہم کو اپنی ہمت اور طاقت کے موافق تو عمل کرنا چاہیے اور میں اطمینان دلاتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اتنا ہی عمل کافی ہے جتنا آپ

(۱) لالچ (۲) بادشاہوں کی خدمت میں (۳) جتنا دے سکتے ہیں۔

کر سکتے ہیں۔ آپ اپنی طاقت سے زیادہ نہ کیجئے۔ حق تعالیٰ نے بندہ کو اس کا مکلف نہیں کیا کہ وہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق عمل کرے بلکہ اسی قدر کا مکلف کیا ہے کہ وہ اپنی طاقت وہمت کے موافق عمل کرے تو اب یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ ہم مستحبات کو اس لیے ترک کر دیں کہ حق تعالیٰ کا حق تو ادا ہو ہی نہیں سکتا۔

طلب راحت اور سستی میں فرق

یہ اور بات ہے کہ کسی وقت مستحب، کسی مصلحت شرعی کی وجہ سے ترک کر دیا جائے (مثلاً لوگوں کو یہ بتلانے کے لیے یہ فعل واجب نہیں یا سفر میں رفقاء کی رعایت سے نوافل وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے تا کہ وہ انتظار سے پریشان نہ ہوں ۱۲) یا کسی وقت تعب(۱) کی وجہ سے اپنی راحت کے لیے ترک کر دیا جائے کہ شرعاً اس وقت ترک مستحبات پر ملامت نہیں۔ چنانچہ راحت حاصل کرنے کے لیے تو حدیث میں وارد ہے:

اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنَيْكَ عَلَيْكَ حَقًّا (۲)

مگر بلاوجہ ترک کرنا اس سے حدیث میں پناہ آئی ہے کیونکہ وہ سستی اور کاہلی ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ۔ (۳)

خوب سمجھ لیجئے کہ طلب راحت اور چیز ہے اور سستی اور چیز ہے دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ طلب راحت کا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امر فرمایا ہے اور اس کے لیے بعض صحابہ کو ترک مستحبات وتقلیل نوافل (۴) کی ترغیب دی ہے اور سستی سے آپ نے پناہ مانگی ہے (اب سمجھئے کہ طلب راحت اور سستی میں کیا فرق ہے۔ طلب راحت اس وقت ہوا کرتی ہے جب آدمی اپنی طاقت کے موافق کام کر چکا ہو اس کو حکم ہے کہ بس طاقت سے زیادہ نہ کرو، جا کر آرام کرو اور سستی یہ ہے کہ اپنی طاقت و ہمت کے موافق بھی کام نہ کرے بلکہ تھوڑا سا کر کے عمل کو چھوڑ دے اس سے پناہ آئی ہے)۔

(۱) تھکاوٹ (۲) "یعنی تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے" مسند احمد: ۶/ ۲۶۸ (۳) "خدایا! عجز اور سستی سے آپ سے پناہ مانگتا ہوں" الصحیح للبخاری: ۴/ ۲۸ (۴) مستحب کو چھوڑنے اور نوافل میں کمی کرنے کا حکم دیا۔

مستحبات کے ثمرات

غرض خدا تعالیٰ کے ساتھ ہمارا بڑا تعلق ہے اس کے لحاظ سے مستحبات بھی ضروری ہیں۔ یہ میں اس شبہ کا جواب دے رہا ہوں جو میرے اس قول پر ہوا تھا کہ خدا تعالیٰ کے کام کا ہر ہر جز وضروری ہے چونکہ قرآن میں مستحبات کا بھی ذکر ہے اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے تو میں نے بتلادیا کہ تعلیم ان کی بھی ضروری ہے کیونکہ ان کے برکات وثمرات بیشمار ہیں۔ چنانچہ ایک برکت تو یہ ہے کہ بعض اوقات مستحبات معصیت سے مانع ہوجاتے ہیں(۱) (کیونکہ جو شخص تہجد واشراق کا پابند ہوگا وہ بہ نسبت اس شخص کے معاصی سے زیادہ بچے گا جو محض پانچ وقت کے فرائض ہی ادا کرتا ہے اور اس میں علاوہ خاصیت کے ایک طبعی راز یہ ہے کہ مستحبات کی پابندی سے یہ شخص دیندار، تہجد گزار مشہور ہوجاتا ہے تو اس لقب کے ساتھ گناہوں کے ارتکاب سے وہ خود بھی شرمانے لگتا ہے ۱۲) اور بعض اوقات کوئی فعل مستحب حق تعالیٰ کو ایسا پسند آجاتا ہے کہ وہ ہی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

لفظ اللہ اعرف المعارف ہے

چنانچہ یہ ایک نحوی ہے جو عقیدے کے لحاظ سے معتزلی ہے(۲) اور عقائد فاسدہ پر سخت عذاب نار کا استحقاق ہوتا ہے مگر مرنے کے بعد ان کو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، کہا مجھے بخش دیا، پوچھا کس بات پر بخش دیا، کہا ایک نحو کے مسئلہ پر میری نجات ہوگئی وہ مسئلہ یہ ہے کہ معرفہ کی بحث میں نحاۃ نے اختلاف کیا ہے کہ اعرف المعارف کون ہے(۳)۔ کسی نے ضمیر متکلم کو اعرف المعارف کہا کسی نے ضمیر مخاطب کو، میں نے یہ کہا کہ لفظ اللہ اعرف المعارف

(۱) گناہوں سے رکنے کا سبب بن جاتے ہیں (۲) ایک فرقہ ہے جن کے عقیدے فاسد ہیں جن پر دوزخ کے عذاب کا اندیشہ ہے (۳) اسم کی دو قسمیں ہیں ایک معرفہ ایک نکرہ۔ معرفہ کسی خاص چیز شخص یا جگہ کے نام کو کہتے ہیں اور نکرہ عام ہے۔ جیسے زید خاص شخص کو کہیں گے اور رجل ہر مرد کو چنانچہ رجل نکرہ اور زید معرفہ۔ بحث یہ تھی کہ سب سے زیادہ متعین کونسا معرفہ ہے۔

ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی معرفہ متعین نہیں کیونکہ لفظ اللہ میں بجز ذات حق کے (۱) کسی کا احتمال ہی نہیں۔ حق تعالیٰ نے اس بات پر فرمایا کہ تم نے ہمارے نام کی بہت تعظیم کی جاؤ تم کو بخشا گیا۔ دیکھئے اس نحوی کی مغفرت ایسے عمل مستحب پر کی گئی جو اس نے بہ نیت ثواب بھی نہ کیا تھا بلکہ مسئلہ نحو کے طور پر ایک بات کہی تھی مگر اسی پر فضل ہوگیا اور باوجود فساد عقیدہ اور استحقاق نار کے بخش دیا گیا۔

بلی پر ترس کھانے سے نجات

اسی طرح ایک بزرگ جاڑے کی رات میں (۲) چلے جارہے تھے راستے میں ایک بلی کا بچہ دیکھا جو سردی سے ٹھٹھر رہا تھا ان کو رحم آیا اور اسے گود میں اٹھا کر گھر لائے اور لحاف میں چھپالیا، جب انتقال ہوگیا تو پوچھا گیا بتلاؤ ہمارے واسطے کیا لائے۔ انہوں نے بہت سوچ سوچ کر یہ خیال کیا کہ اور اعمال تو میرے کسی قابل ہیں نہیں ان کو کیا پیش کروں لیکن الحمدللہ مجھے ایمان کی دولت حاصل ہے اس میں ریاء وغیرہ بھی کچھ نہیں ہوسکتا، بس ایمان کو پیش کرنا چاہیے۔ اس لیے عرض کیا کہ میں توحید لایا ہوں، وہاں سے اعتراض ہوا ''تذکر لیلۃ اللبن'' یعنی وہ دودھ والی رات بھی یاد ہے اس میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ تھا کہ ایک رات ان بزرگ نے دودھ پیا تھا اس کے بعد پیٹ میں درد ہوگیا صبح کو ان کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ رات دودھ پیا تھا اس سے پیٹ میں درد ہوگیا۔ حق تعالیٰ نے اس واقعہ کو یاد دلا کر توحید پر گرفت فرمائی کہ یہی توحید کا دعویٰ ہے کہ ہم کو چھوڑ کر تم نے دودھ کو مؤثر کہا اور درد کے فعل کو اس کی طرف منسوب کیا۔ اب تو بیچارے تھر تھرا اٹھے۔ پھر ارشاد ہوا کہ تم نے اپنے دعوے کی حقیقت کو دیکھ لیا، لو اب ہم تم کو ایک ایسے عمل پر بخشتے ہیں جس کی بابت تم کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ یہ موجب نجات ہوجائے گا۔ تم نے ایک رات ایک بلی کے بچے کو جو سردی میں مر رہا تھا اپنے لحاف میں سلایا تھا اس نے تمہارے حق میں دعا کی تھی جو ہم نے قبول کرلی۔ جاؤ آج اس بلی کے بچے کی دعا پر تم کو بخشتے ہیں تم نے ہماری ایک مخلوق پر رحم کیا تھا۔ تو ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم پر رحم کریں۔

(۱) سوائے اللہ کی ذات کے (۲) سردی کی رات۔

مستحبات میں عنایات و برکات

تو صاحبو! یہ عنایات و برکات ہوتی ہیں احادیث میں ایسے بہت واقعات آئے ہیں کہ بعض لوگوں کی ایک ادنیٰ فعل مستحبات پر مغفرت ہوگئی۔ چنانچہ ایک فاحشہ عورت کا قصہ حدیث میں آتا ہے کہ اس نے گرمی کی دو پہر میں ایک کتے کو دیکھا جو پیاس کے مارے زمین کی تر مٹی چاٹ رہا تھا۔ اس کو رحم آیا اور پاس ہی ایک کنواں تھا اس سے پانی نکال کر کتے کو پلانا چاہا مگر دیکھا تو کنویں پر ڈول ہے نہ رسی۔ اب وہ سوچنے لگی کہ پانی کیونکر نکالوں۔ مثل مشہور ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ آخر اس نے ایک ترکیب نکالی وہ یہ کہ اپنی اوڑھنی کو تو رسی بنایا اور پیر میں چمڑے کا موزہ تھا اسے ڈول بنایا اس طرح پانی نکال کر کتے کو پلایا، پھر کچھ دنوں کے بعد اس کا انتقال ہوگیا اس فاحشہ کی مغفرت اس عمل پر ہوگئی۔ لیجئے ساری عمر تو سیاہ کاری میں گزاری اور ایک ذرا سے عمل مستحب پر مغفرت ہوگئی۔ واقعی سچ ہے:

رحمت حق بہانہ می جوید　　رحمت حق بہا نمی جوید(۱)

واقعات رحم سننے کے دو اثر

(اس لیے عمل کو حقیر نہ سمجھو نہ معلوم کون سا کام اس کو پسند آجائے ۱۲) مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رحمت پر بھروسہ کر کے عمل ہی چھوڑ دو۔ آج کل اس مذاق کے لوگ بھی ہیں جن پر واقعات رحمت کے سننے سے یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ عمل کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ بات یہ ہے کہ ان حکایات کی مثال بارش جیسی ہے اور یہی کیا جتنی بھی نصوص ہیں (۲) سب کی یہی مثال ہے تو بارش فی نفسہ نہایت لطیف اور روح پرور ہے مگر اس کا اثر ہر محل کی قابلیت وعدم قابلیت کے مناسب جدا ہوتا ہے۔ اگر عمدہ زمین ہے تو بارش سے اس میں پھول پھلواری اور عمدہ پھل پیدا ہوں گے اور اگر شور زمین ہے تو اس میں جتنی بارش ہوگی اتنے ہی کانٹے اور جھاڑ جھنکاڑ پیدا ہوں گے

(۱) ''اللہ تعالیٰ کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے رحمت حق قیمت نہیں مانگی'' (۲) شرعی احکام ہیں۔

شیخ سعدی فرماتے ہیں:

براں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس (۱)

اسی طرح واقعات رحمت کو سن کر دو اثر ہوتے ہیں جو لوگ علیل المزاج ہیں (۲) وہ تو سمجھتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ ایک ذرا سے نکتہ پر بخش دیتے ہیں تو عمل صالح کی کیا ضرورت ہے اور جو شریف المزاج ہیں (۳) وہ اس کو سن کر پہلے سے زیادہ اطاعت پر گرتے ہیں اور کہتے ہیں:

تصدق اپنے خدا کے جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھ کو انشا
ادھر سے ایسے گناہ پیہم ادھر سے وہ دمبدم عنایت

بلکہ میں ایک نئی بات کہتا ہوں کہ بعض اوقات بدوں (۴) سزا کے معافی دے دینے پر اہل دل اس قدر شرمندہ ہوتے ہیں کہ کچھ سزا مل جاتی تو اتنے شرمندہ نہ ہوتے، سزا مل جانے پر تو کچھ شرمندگی کم ہوجاتی، مگر سنگین جرم کو ویسے ہی معاف کردینا تو گویا ان کو ذبح کردینا ہے۔ اب تو مارے ندامت کے وہ زمین میں گر جاتے ہیں۔ یہ ایک حالت ہے جس پر گزرتی ہے وہی اس کو سمجھ سکتا ہے اور جس نے اس حالت کو سمجھا ہوگا وہ اس آیت کی تفسیر بے تکلف سمجھ لے گا۔ {فَاَثَابَكُمْ غَمًّام بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ} (۵)

غزوہ احد میں حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اجتہادی غلطی

اس کا قصہ یہ ہے کہ جنگ احد میں بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ایک غلطی ہوگئی تھی وہ یہ کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ شروع ہونے سے پہلے جب لشکر کی صف بندی فرمائی تو پچاس آدمیوں کو پہاڑ کی ایک گھاٹی پر متعین فرمایا اور ان سے ارشاد فرمایا کہ تم یہاں سے بدوں (۶) میری اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا خواہ ہمارے اوپر کچھ

(۱) ''بارش کہ اس کی لطافت طبع سے اختلاف نہیں بلکہ زمین کی قابلیت میں اختلاف ہے۔ باغ لالہ اُگتا ہے اور بنجر زمین میں جھونڈ جھنکاڑ'' آل عمران: ۳/ ۱۵۳ (۲) جنکا مزاج خراب ہے (۳) جنکا مزاج درست ہے (۴) بغیر (۵) ''سو خدا تعالیٰ نے تم کو پاداش میں غم دیا بسبب غم دینے کے تا کہ تم مغموم نہ ہو اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے' (۶) بغیر۔

ہی حالت گزر جائے۔ اس گھاٹی کی اس قدر حفاظت کی یہ ضرورت تھی کہ اس راستے سے دشمن کے آجانے کا اندیشہ تھا اور یہ گھاٹی لشکر اسلام کی پشت پر تھی۔ اگر دشمن کی فوج کا ایک دستہ ادھر سے آجاتا اور ایک دستہ مقابل ہوکر لڑتا تو مسلمان بیچ میں گھر جاتے اور ظاہر ہے کہ آگے پیچھے دونوں طرف سے لشکر کا گھر جانا سخت خطرناک ہے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صف بندی کرتے ہوئے اس گھاٹی پر ایک جماعت کو تاکید کے ساتھ متعین فرمایا۔ خدا تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قوت انتظام بھی ایسی عطا فرمائی تھی کہ غیر اقوام بھی اس کو تسلیم کرتی ہیں حتی کہ وہ تو اشاعت اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت عقلیہ ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں تو وہ ہم سے بھی زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت عقلیہ کے معتقد ہوئے کہ جس چیز کو ہم امداد غیبی کا نتیجہ سمجھتے ہیں وہ اس کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت عقلیہ پر محمول کرتے ہیں اس انتظام کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام کو حملے کی اجازت دی اور الحمد للہ تھوڑی ہی دیر میں مسلمانوں کو کھلی فتح حاصل ہوئی کہ ابوسفیان بن حرب جو اس وقت لشکر کفار کے سردار تھے مع لشکر کے بھاگ پڑے (اور جھنڈا بھی گر پڑا) حضرت ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ بھی بھاگیں اور بھاگتے ہوئے ان کے خلخال(۱) اور پنڈلیاں تک کھل گئیں، غرض کفار کو شکست فاش ہوئی اور مسلمان ان کے تعاقب میں دوڑے۔ ان پچاس آدمیوں میں اختلاف ہوا جو گھاٹی پر متعین تھے۔ بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کے لیے ہم کو یہاں متعین فرمایا تھا وہ غرض حاصل ہوچکی ہے اس لیے حکم قرار(۲) بھی ختم ہوگیا اب یہاں سے ہٹنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ نہیں کیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیے۔ ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کررہے ہیں ہم کو مال غنیمت جمع کرلینا چاہیے۔ بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمادیا تھا کہ بدوں میری اجازت

(۱) پازیب (۲) یہاں ٹھہرنے کا حکم بھی اب باقی نہیں رہا۔

کے یہاں سے نہ ہٹنا اس لیے ہم کو بدون آپ کی اجازت کے (۱) ہرگز کچھ نہ کرنا چاہیے مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہوگئے یہ ان سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک افسر رہ گئے۔

حضرت خالد بن ولید اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے اور اس جنگ میں وہ لشکر کفار کی طرف تھے یہ ہمیشہ سے بڑے مدبر (۲) اور جنگ آزمودہ ہیں۔ انہوں نے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے تاکہ اس گھاٹ کی خبر وقتاً فوقتاً ان کو پہنچاتے رہیں۔ چنانچہ عین اس وقت جبکہ حضرت خالد مع تمام لشکر کفر کے بھاگے جارہے تھے ان کے جاسوس نے اطلاع دی کہ اب وہ مورچہ خالی ہے اور بجز دس گیارہ آدمیوں کے وہاں کوئی نہیں ہے۔ حضرت خالد نے بھاگتے بھاگتے اپنا رخ پلٹا اور پانچ سو جوانوں کو ساتھ لے کر اس گھاٹی پر پہنچ گئے۔ دس گیارہ صحابی جو وہاں باقی رہ گئے تھے ان سے مقابل ہوئے مگر تھوڑی ہی دیر میں سب شہید ہوگئے اور حضرت خالد نے مسلمانوں کے پیچھے سے آکر ان پر حملہ کردیا یہ رنگ دیکھ کر کفار کا باقی لشکر بھی لوٹ پڑا اور مسلمان آگے پیچھے دونوں طرف سے نرغے میں آگئے اور جس خطرے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حفاظت فرمائی تھی بعض صحابہ کی اجتہادی غلطی سے اس خطرے کا سامنا ہوگیا۔ چنانچہ ستر کے قریب مسلمان شہید ہوئے اور شیطان کی اس جھوٹی آواز پر کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل ہوگئے، بہت سوں کے پیر اُکھڑ گئے اور جنگ کا نقشہ بالکل پلٹ گیا۔ (یہ سب کچھ ہوا مگر بایں ہمہ مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی کیونکہ شکست کے معنی یہ ہیں کہ لشکر مع سردار کے بھاگ جائے، اور یہاں ایسا نہیں ہوا کیونکہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع چند جاں نثاروں کے میدان میں برابر جمے رہے آپ کبھی نہیں بھاگے اور تھوڑی دیر کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ بھاگنے والوں کو پکارے تو فوراً میدان میں سب مسلمان آموجود ہوئے، ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو نمایاں فتح حاصل نہیں ہوئی ۱۲)

(۱) آپ کی اجازت کے بغیر (۲) بڑے سمجھدار اور جنگی مہارت رکھتے تھے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے

حق تعالیٰ نے اس واقعہ میں مسلمانوں پر مصیبت آنے کا سبب ان صحابہ کی غلطی اجتہادی کو قرار دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر گھاٹی سے ہٹ گئے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے: {وَعَصَيْتُمْ مِّنْ م بَعْدِ مَآ اَرٰكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ}(۱)

اس کے بعد بطور عتاب کے فرماتے ہیں: {فَاَثَابَكُمْ غَمًّام بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ} (۲) یعنی پھر خدا تعالیٰ نے تم کو بھی غم دیا بدلہ (اس) غم کے (جو تم نے نافرمانی کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا) اس کے بعد اس انتقام کی حکمت ارشاد فرماتے ہیں: {لِكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ} تاکہ تم کو (انتقام لینے کے بعد) اس بات پر زیادہ رنج نہ ہو جو تم سے فوت ہوگئی تھی۔ یہ وہی بات ہے جو میں نے ابھی بیان کی تھی کہ بعض شریف طبیعتوں پر خطا کا انتقام نہ لینے سے ندامت زیادہ غالب ہوتی ہے۔ اور انتقام لے لینے سے ندامت کم ہوجاتی ہے۔ اس بنا پر ارشاد ہے کہ ہم نے تم کو تھوڑی سی مصیبت اس لیے دیدی تاکہ بدوں سزا کے معافی دینے سے تم پر ندامت ورنج کا زیادہ غلبہ نہ ہو۔ بعض مفسرین نے اس جگہ ''لِكَيْلَا تَحْزَنُوْا'' (تاکہ تم مغموم نہ ہو) میں ''لاء نافیہ'' کو زائد مانا ہے۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ موقع عتاب کا ہے اور سزا تو رنج دینے ہی کے لیے دی جاتی ہے پھر اس کا کیا مطلب کہ تم کو اس لیے غم دیا تاکہ تم مافات پر رنج نہ کرو ان کے نزدیک ''لا'' کو اپنے معنی پر رکھ کر مطلب نہ بن سکا اس لیے انہوں نے ''لا'' کو زائد کہہ کر یہ مطلب بیان کیا کہ تم کو غم دیا تاکہ تم کو مافات پر رنج ہو مگر جس نے اس حالت کو سمجھا ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے وہ سمجھے گا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے۔ اگر ان کی خطا بدون کسی انتقام کے معاف کردی جاتی تو عمر بھر مارے ندامت کے آنکھ نہ اٹھا سکتے اس لیے ان کو تھوڑی سی مصیبت دے دی گئی تاکہ زیادہ رنج غالب نہ ہو۔ پس

(۱) ''اور تم کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دل خواہ بات دکھادی گئی تھی'' آل عمران: ۳/۱۵۲ (۲) ''سو خدا تعالیٰ نے تم کو پاداش میں غم دیا بسبب غم دینے کے تاکہ تم مغموم نہ ہو اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ سزا ہمیشہ رنج دینے ہی کے لیے ہوا کرتی ہے بلکہ بعض دفعہ رنج کو کم کرنے کے لیے بھی سزادی جایا کرتی ہے۔ اس حالت پر نظر کر کے تفسیر نہایت صاف ہے اور لاکو زائد کہنے کی کچھ ضرورت نہیں اب بتلایئے جس شخص کی یہ حالت ہو کہ خطا کر کے بدون سزا کے اسے چین ہی نہ پڑے وہ واقعات رحمت سن کر گناہوں پر دلیر ہوگا یا غیرت سے زمین میں گڑ جائے گا۔ یقینا جو لوگ صحیح المزاج ہیں اور جن کو خدا تعالیٰ سے محبت کا تعلق ہے وہ تو واقعات رحمت سن کر پہلے سے زیادہ اطاعت کریں گے۔ نمک حرام ہے وہ نوکر جس کو خطا بدون سزا کے معاف کر دی جائے تو ناز کرنے لگے اور نافرمانی پر دلیر ہوجائے، شریف وہ ہے جو آقا کی اس عنایت کو دیکھ کر عمر بھر کے لیے گڑ جائے اس لیے میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو واقعات رحمت سننے سے یہ ضرر ہوتا ہے کہ وہ عمل میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں ان میں مرض ہے ان کو اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق محبت پیدا کرنا چاہیے پھر ان پر مستحبات کی بدولت عمر بھر کا دلدر دھل جاتا ہے (۱) تو یہ کتنی بڑی رحمت ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو مستحبات کی تعلیم فرمائی۔ اب وہ شبہ بالکل جاتا رہا کہ قرآن کا ہر جزو ضروری کہاں ہے بلکہ بعض مستحبات بھی ہیں جو غیر ضروری ہیں۔

وعظ میں سامعین کی ضرورت کا اہتمام

اس تقریر سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ مستحبات بھی تعلیم کے درجے میں تو نہایت ہی ضروری ہیں اور باعتبار ثمرات (۲) کے عمل میں بھی ایک گونہ ضروری ہیں اب وہ دعویٰ صحیح رہا کہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا ہر جزو ضروری ہے اور میرا کہنا بھی صحیح ہوگیا کہ اس آیت میں مثل دوسری آیات کے ایک نہایت ضروری مضمون ہے۔ رہی یہ بات کہ پھر اسی کو کیوں اختیار کیا گیا تو اصل یہ ہے کہ ضروری تو سب ہیں مگر کسی وقت کسی خاص مضمون کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس لیے موقع اور وقت کے لحاظ سے کسی خاص مضمون کو ترجیح ہوجاتی ہے۔ کبھی ایک تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے، کبھی دوسری تعلیم کی اور اس کے لیے خدا تعالیٰ ہر ضرورت کے موقع پر اپنے

(۱) عمر بھر کا میل کچیل دھل جاتا ہے (۲) نتائج کے اعتبار سے۔

بندوں کے دل میں القاء کردیتے ہیں کہ اس وقت اس مضمون کو بیان کرنا چاہیے یہ کام بھی وہ خود ہی کرتے ہیں ورنہ بیان کرنے والے کو کیا معلوم ہوسکتا ہے کہ اس وقت سامعین کو کس مضمون کی زیادہ ضرورت ہے، میں خود اپنی حالت دیکھتا ہوں کہ بعض دفعہ سوچنے سے کوئی مضمون ذہن میں نہیں آتا بلکہ اکثر خود بخود القاء ہوجاتا ہے سفر میں جہاں کہیں بیان ہوتا ہے تو اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی نے ہماری حالت اس سے کہہ دی ہے کیونکہ بیان ان کی حالت کے مناسب ہوتا ہے۔ مگر الحمدللہ میری یہ عادت نہیں ہے کہ مسلمانوں کی حالت کا تجسس کروں نہ مجھ سے فرمائشی مضمون کبھی بیان ہوسکے بلکہ توکلاً علی اللہ (۱) بیان شروع کردیتا ہوں اور جو باتیں اللہ تعالیٰ دل میں ڈال دیتے ہیں بیان کردیتا ہوں اور وہ اکثر سامعین کی ضرورت وحالت کے مطابق ہوجاتی ہیں اس سے لوگوں کو شبہ ہوجاتا ہے کہ کسی نے ہماری حالت اس سے کہہ دی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس کو کشف سمجھیں مگر مجھے تو عمر بھر بھی کشف نہیں ہوا اور اس میں کشف کی کیا بات ہے بس حق تعالیٰ جس سے کام لینا چاہتے ہیں لے لیتے ہیں۔ اتنی بات تو ہے کہ بحمداللہ بیان کے وقت یہ نیت ضرور ہوتی ہے کہ اے اللہ ایسا مضمون بیان ہو جو ان لوگوں کی ضرورت کا ہو جس سے ان کی اصلاح ہوجائے۔ خدا تعالیٰ کو تو علم غیب ہے وہ سب کی حالت جانتے ہیں وہ اس نیت کے بعد ضرورت وحالت کے مطابق مضمون دل میں ڈال دیتے ہیں کہ آج یہ بیان کرو۔

یہی وجہ ہے کہ بعض ہفتوں میں کوئی بات ذہن میں نہیں آتی تو میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج یہ آیت بیان کے لیے ذہن میں آئی تو میں سمجھتا ہوں کہ اس مضمون کی دوسرے مضامین سے ضرورت زیادہ ہے اس لیے اس کو اختیار کیا۔

بدحالی کا سہل علاج

بہرحال اس آیت میں ایک ضروری مضمون ہے جس میں حق تعالیٰ نے ہماری

(۱) اللہ پر اعتماد کرکے بیان شروع کردیتا ہوں۔

بدحالی کا ایک نہایت سہل(۱) علاج بیان فرمایا ہے۔اس میں تو شک نہیں کہ ہم لوگ بدحال ہیں کوئی شخص بھی اس سے بری نہیں۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ کسی کی تباہی کم ہے کسی کی زیادہ، باقی بدحالی میں سب مبتلا ہیں۔ الا ماشاء اللہ(۲) اور جن کی تباہی کم ہے وہ بہ نسبت ان لوگوں کے زیادہ پریشان ہیں جن کی تباہی زیادہ ہے اس لیے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس مضمون کی ضرورت انہیں لوگوں کو ہے جو بہت تباہ حال ہیں اور جو کم تباہ حال ہیں ان کو ضرورت ہی نہیں یا کم ضرورت ہے بلکہ برعکس حالت یہ ہے کہ جن کی تباہی کم ہے ان کو اس کی ضرورت زیادہ ہے کیونکہ وہ بہ نسبت دوسروں کے زیادہ پریشان ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہم نے اپنے بعض دوستوں کو دیکھا ہے جن پر قرض بہت زیادہ ہے کہ وہ بہ نسبت ان لوگوں کے زیادہ فکر میں ہیں جن پر قرض تھوڑا سا ہے۔ بس ان کو تو قرض کی عادت ہوگئی ہے اور اس کے بار کا حس ہی نہیں رہا اب وہ قرض لینے میں بڑے دلیر ہوگئے ہیں اور جس کو قرض کی عادت نہیں اور اسکے ذمہ تھوڑا سا قرض ہوگیا ہے جس کے ادا ہونے کی توقع بھی ہے وہ زیادہ پریشان ہے۔ بعض دفعہ اسکو راتوں کی نیند نہیں آتی اور وہ ان لوگوں کی حالت پر تعجب کرتا ہے جو ہزاروں کے مقروض ہوکر بھی رات کو چین سے سوتے ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ مصیبت کی فکر اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک اس کے زوال کی امید ہو اور جب زوال کی امید نہ رہے تو اب فکر نہیں رہتی بلکہ وہ طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے جیسے دائمی مرض طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے۔

اسی طرح جو لوگ کم گناہ کرتے ہیں وہ زیادہ مغموم و پریشان ہیں اور جو زیادہ گناہ کرتے ہیں وہ زیادہ پریشان نہیں ہیں کیونکہ وہ تو بے حس ہوجاتے ہیں بلکہ بعض اوقات انسان کثرت گناہ کے سبب مایوس ہوجاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب میری مغفرت تو ہو نہیں سکتی پھر لذات میں بھی کیوں کمی کروں، پھر وہ دل کھول کر گناہ کرتا ہے۔ حتی کہ جب مرنے کا وقت آتا ہے تو وہ اس وقت بھی توبہ و استغفار نہیں کرتا اور اگر اس سے توبہ کو کہا جائے تو صاف انکار کردیتا ہے اور کہتا ہے کہ اتنے گناہوں کو ایک توبہ کیا کافی ہوگی۔

(۱) آسان (۲) شاذ و نادر کوئی بچا ہو۔

چنانچہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کو مرتے وقت کلمہ پڑھنے کو کہا گیا تو اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ ایک کلمہ سے کیا ہوگا میرے تو گناہ اس قدر ہیں کہ ان کو ہزار کلمے بھی نہیں دھو سکتے مایوسی تھی اور خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

کثرت گناہ کا اثر

تو بعض دفعہ کثرت گناہ انسان کو مایوس بنا کر کفر تک پہنچا دیتے ہیں (خدا ہر مسلمان کو اس سے بچائے۔آمین) کثرت گناہ میں تو یہ اثر ہی ہے مگر آپ حیرت کریں گے کہ بعض دفعہ یہی اثر اطاعت میں بھی ہو جاتا ہے۔یہ بات کسی کے ذہن میں نہیں آسکتی مگر قربان جایئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ نے اس کو سمجھا ہے اور یہاں سے آپ کو معلوم ہوگا کہ واقعی ہم کو کیسے کامل واکمل رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عطا ہوئے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کہاں تک پہنچی ہے اور یہی چیز ہے جو صرف انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوئی ہے۔اسی سے انبیاء علیہم السلام حکماء سے ممتاز ہیں۔حکماء کے پاس صرف محسوسات کا علم ہے اور وہ محسوسات ہی کے خواص کو جانتے ہیں، انہی کی ترکیب وتحلیل کیمیاوی طریقہ سے کر سکتے ہیں بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ وہ معانی معقولہ کے خواص کو جانتے ہیں اور جو چیز نظر نہیں آتی بلکہ محض اعتباری وعقلی شے ہے اس کے آثار کو انہوں نے ایسا صحیح سمجھا ہے کہ کیا کوئی کیمیاوی طریقے سے ان کی تحلیل کر کے سمجھے گا اور یہیں سے آپ کو فقہاء کی بھی قدر ہوگی کیونکہ یہ حضرات علوم انبیاء ہی کے حامل ہیں اور معانی معقولہ ہی کی ترکیب وتحلیل وبیان خواص میں مشغول ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باریک بینی

تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باریک بینی دیکھئے کہ اعمال شر پر برا اثر مرتب ہوتا تو کسی کی سمجھ میں آسکتا تھا مگر آپ کی نظر دور پہنچی کہ بعض دفعہ اعمال خیر پر بھی برا اثر مرتب ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو آپ کی شان تو یہ ہے۔

(عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ وَاَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَاْدِیْبِیْ)(۱)

جس کو خدا تعالیٰ نے لکھایا پڑھایا ہو اس کی نظر جتنی دور بھی پہنچے کم ہے۔

طاعات میں اعتدال کی عجیب مثال

بظاہر تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ طاعت (۲) جتنی بھی ہو اچھی ہے، طاعت کے لیے کوئی حد نہ ہونا چاہیے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سمجھا کہ طاعت کے لیے بھی ایک حد ہے اور اسی حد تک وہ محمود ہے اس سے آگے بڑھنا اچھا نہیں ورنہ اثر برا پیدا ہوگا اور اسکی ایسی مثال ہے جیسے مریض کو دوا کرنا اچھا ہے اور ترک دوا برا ہے لیکن دوا کرنے کی بھی ایک حد ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ دوا اچھی شے ہے تو اس کے لیے کوئی حد ہی نہ ہو بلکہ یہی حال طاعات کا ہے کہ ان کے لیے بھی ایک حد ہے۔ گو وہ فی نفسہ اچھی چیزیں ہیں ان کو انبیاء علیہم السلام ہی نے سمجھا ہے جو اطباء روحانی ہیں۔ انہوں نے بتلادیا کہ طاعات بھی دوا کی طرح ہے جیسے ہر دوا کے لیے مقدار اکل وشرب (۳) متعلق ہوتی ہے، طاعات کے لیے بھی درجات معین ہیں۔ چنانچہ خوف الٰہی ایک بڑی طاعت ہے جس کا جابجا نصوص میں حکم ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی ایک حد بیان فرمائی ہے۔

خوف کا اعتدال

ایک دعا میں آپ فرماتے ہیں: ''اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ مِنْ خَشْیَتِکَ مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعَاصِیْکَ'' یعنی اے اللہ میں آپ سے آپ کا اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھ میں اور معاصی (۴) میں حائل ہوجائے۔ اس میں آپ نے بتلادیا کہ خوف (طبعی) کا ہر درجہ مطلوب نہیں بلکہ وہ اسی قدر مطلوب ہے کہ خدا کی نافرمانی سے روک دے کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ خوف (طبعی) کا زیادہ بڑھ جانا مضر ہے (۵) کیونکہ ایسے شخص کو ہر وقت حق تعالیٰ کے قہر ہی پر نظر ہوگی تو کوئی عمل بد (۶) قابل معافی نہ ہوگا اور عظمت پر نظر کرکے اپنا کوئی عمل قابل قبول نظر نہ آئے گا اور اس کو نجات کی توقع نہ رہے گی۔ نتیجہ یہ کہ

(۱) ''میرے رب نے مجھ کو تعلیم دی، پس بہت اچھی ہوئی میری تعلیم اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ادب دیا پس اچھی ہوئی میری تادیب'' (۲) عبادت (۳) کھانے پینے کی مقدار (۴) گناہوں میں (۵) نقصان دہ (۶) برا عمل۔

رحمت حق سے مایوس ہوجائے گا اور مایوسی کفر ہے تو کیا ٹھکانا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راز دانی کا۔ بھلا کون عاقل اس کی تجویز کرسکتا ہے کہ طاعت بھی سبب کفر ہوسکتی ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سمجھا کہ غلبہ خوف بعض دفعہ سبب یاس(۱) ہوجاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یاس کفر ہے۔ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۔(۲)

اس لیے آپ نے خوف کے سوال میں یہ قید لگادی: ''مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ'' کہ میں اتنا خوف مانگتا ہوں جو معاصی سے روک دے اور بس یہی وہ علوم ہیں جن کو دیکھ کر حکماء بھی دنگ رہ جاتے تھے اور اسی لیے انہوں نے نبوت کی حقیقت کو اپنی کتابوں میں مانا ہے کہ بعض افراد ایسے ہوسکتے ہیں جن پر بلاواسطہ مبداء فیاض کی طرف سے علوم فائض ہوں اور اسی لیے وہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا اقرار کرتے تھے۔ چنانچہ کسی حکیم نے اپنے زمانہ کے نبی کی نبوت کا انکار نہیں کیا بلکہ ان کا اصحاب قوت قدسیہ ہونا تسلیم کیا، وہ ان کے علوم کو دیکھ کر یہ کہہ اٹھے کہ اتنا بڑا علم کسی ریاضت یا تعلیم سے حاصل نہیں ہوسکتا تو معلوم ہوتا ہے کہ مبداء فیاض سے ان کو علم عطا ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ حکماء نے ایک غلطی بھی کی وہ یہ کہ نبوت کو تسلیم کرکے یہ کہا کہ یہ امیین کے واسطے نبی ہیں۔ (یعنی جاہلوں کے واسطے) ہمارے واسطے نبی نہیں ہیں اور نہ ہی ہم کو ان کے اتباع کی ضرورت ہے۔ ''لنا قوم قد هذبنا نفوسنا بالعلم'' کیونکہ ہم نے علوم سے اپنے نفوس کو مہذب بنالیا ہے اب ہم کو کسی مصلح کی ضرورت نہیں، قرآن میں بقول بعض مفسرین ''فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ''(۳) ایسے حکماء کے بارے میں ہے ان کا یہ قول ایسا تھا جیسے بعض یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کرکے یہ کہتے تھے کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو ہیں مگر اہل عرب کے واسطے ہیں۔ ہمارے واسطے نہیں ہیں کیونکہ ہم خود صاحب کتاب ہیں اور وہ کتاب ہمارے لیے موجود ہے۔ اس کا جواب علماء نے خوب دیا کہ تمہارے نزدیک وہ نبی تو ہیں اور نبی کے لیے صادق ہونا

(۱) مایوسی کا سبب (۲) ''اللہ تعالیٰ کی رحمت سے سوائے کافروں کے کوئی مایوس نہیں ہوتا'' سورہ یوسف: ۸۲
(۳) ''اپنے علم سے جو ان کو حاصل ہے خوش ہیں'' سورۂ غافر: ۸۳۔

ضروری ہے اور وہی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ فرماتے ہیں کہ میں تمام عالم کی طرف مبعوث ہوا ہوں اور سب پر میرا اتباع لازم ہے بدون میرے اتباع کے کسی کی نجات نہیں ہوسکتی تم ان کے اس قول کو کیوں نہیں تسلیم کرتے حالانکہ یہ تسلیم کرتے ہو کہ نبی کی بات جھوٹی نہیں ہوسکتی تو ان کو اس بات میں بھی سچا ماننا پڑے گا۔

یونانی حکماء کی ایک غلطی

اس بات کا سچا ماننا تمہارے اس قول کے کذب کو مستلزم ہے کہ وہ خاص اہل عرب کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں ہمارے واسطے نہیں ہیں پس ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا تو جس طرح یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص اہل عرب کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کہا تھا اسی طرح حکماء بھی انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو تسلیم کرکے انہیں خاص عوام کے لیے نبی کہتے تھے اپنے واسطے نبی نہ کہتے تھے۔ خیر یہ غلطی تو ان سے ہوئی مگر انبیاء کے علوم عالیہ کی وجہ سے نبوت کا انکار نہیں کیا بلکہ اس کی حقیقت کو تسلیم کرکے اپنی کتابوں میں ''علم النوامیس'' کے عنوان سے اس کو ذکر کیا ہے اور آج کل کے حکماء جو حقیقت نبوت ہی کا انکار کرتے ہیں تو حقیقت میں یہ حکماء نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ واقع میں صنّاع ہیں کہ عجیب وغریب صنعتوں کے موجد ہیں، گو صنعت بھی مفید چیز ہے۔ مگر اس سے آدمی حکیم نہیں بن سکتا۔ حکمت علوم معانی سے حاصل ہوتی ہے اور حکماء عصر کے پاس معانی خاک نہیں ہیں بس ان کے پاس جو کچھ ہے مشاہدہ ہے ان سے بہتر حکماء تو وہی تھے یعنی حکماء یونانی کیونکہ وہ لوگ اہل معانی تھے۔ گو معانی میں انہوں نے غلطیاں کی ہیں اور ایسی غلطیاں کی ہیں کہ علوم نبوت ظاہر ہونے کے بعد مسلمانوں کا ایک بچہ بھی ان کی غلطی پکڑ سکتا ہے مگر پھر بھی ان کے پاس کچھ معانی عقلیہ کا ذخیرہ تھا تو سہی۔ اسی لیے وہ حقیقت نبوت کا انکار نہ کرسکے، حکماء عصر کے پاس تو علوم عقلیہ ہیں ہی نہیں۔ اس لیے وہ انبیاء علیہم السلام کے علوم کی قدر نہیں جان سکتے۔ یہی وجہ ہے ان کے انکار نبوت کی۔

گناہوں کی کثرت مایوسی کا باعث بن جاتی ہے

میں یہ کہہ رہا تھا کہ بعض دفعہ زیادہ گناہوں کی وجہ سے انسان کو مایوسی ہوجاتی ہے تو وہ دل کھول کر گناہ پر دلیر ہوجاتا ہے اب اس کو گناہوں سے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی کیونکہ مثل مشہور ہے ''الیاس احدی الراحتین''(۱) اور جس نے تھوڑے گناہ کیے ہیں وہ رحمت ومغفرت سے مایوس نہیں ہے بلکہ اس کو امید ہے اور امید کی وجہ سے معافی کی فکر بھی ہے تو وہ زیادہ پریشان ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ جو لوگ کم تباہ حال ہیں ان کو اس مضمون کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ وہ زیادہ پریشان ہیں۔

ظاہر میں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ گناہوں کی کثرت سے غم زیادہ ہوتا ہوگا مگر واقع میں اس کے برعکس ہے کہ تھوڑے گناہ والے کو زیادہ غم ہوتا ہے اور ان میں سے جو خاص لوگ ہیں ان کی تو یہ حالت ہے:

بردل سالک ہزاراں غم بود گر زباغ دل خلالے کم بود(۲)

یعنی گناہ تو گناہ اگر اس کی قلبی حالت میں ذرا سا بھی تغیر ہوجاتا یا ایک دار بھی کم ہوجاتا ہے تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ جاتا ہے اگر اس وقت کوئی شیخ محقق مل گیا تو اس کی تسلی سے سنبھل جاتا ہے ورنہ بعض دفعہ ہلاکت تک کی نوبت آتی ہے چونکہ مولانا محقق ہیں اس لیے دوسری جگہ تسلیم بھی فرماتے ہیں:

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو آں صلاح تست آیں دل مشو
چونکہ قبض آمد تو دروے بسط بیں تازہ باش وچیں می فگن برجبیں(۳)

تسلی شیخ کے بعد پریشان ہونا برا ہے

اس کا یہ مطلب کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ قبض سے تنگ آنا اور پریشان ہونا نازیبا حرکت اور بری حالت ہے، ہرگز نہیں کیونکہ قبض سے پریشانی کا ہونا تو طبعی اور

(۱) ''کہ ناامیدی سے بھی گونہ راحت ہوجاتی ہے ۱۲ظ''(۲) ''سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں، اگر اس کی باطنی حالت میں ایک تنکا کم ہوجاتا ہے''(۳) ''اے سالک جب بچہ کو قبض کی حالت پیش آئے تو ناامید مت ہو وہ تیری اصلاح کے لیے ہے۔ جب تجھ کو قبض پیش آئے تو اس میں بسط دیکھ کر خوش وخرم ہو پریشانی پر بل نہ ڈال۔

لازمی امر ہے ہاں شیخ کی تسلی کے بعد عقلاً پریشان رہنا یہ برا ہے اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو تسلی قبض پر نہیں ہوتی یعنی شیخ کی تسلی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ خود قبض (۱) کی ذات سے راضی رہو اور یہ بالذات مطلوب حالت ہے اس پر خوش رہو بلکہ تسلی ان مصالح اور منافع پر ہوتی ہے جو اکثر قبض پر مرتب ہو جاتے ہیں (اسی کی ایسی مثال ہے جیسے بیمار کی تسلی کی جاتی ہے کہ میاں بخار آ گیا تو کیا حرج ہے بدن کا تنقیہ (۲) ہو گیا یا گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔ تو مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بیماری مطلوب شے ہے (۳) اس پر راضی رہو بلکہ بیماری سے جو بدن کا تنقیہ (۴) ہو گیا ہے اور بعض فوائد حاصل ہو گئے ہیں ان پر تسلی کی جاتی ہے کہ ان منافع کا خیال کر کے پریشانی کو کم کرنا چاہیے ورنہ جس طرح بیماری خود فی ذاتہ تسلی کے قابل نہیں ہے اسی طرح قبض پر اپنی ذات سے تسلی کوئی شے نہیں ہے ۱۲ ظ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ثقل (۵) وحی کی کیفیت

ہم اور آپ تو کیا چیز ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اول وحی نازل ہوئی ہے تو اس کا قصہ حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ پہلے دن ثقل وحی سے یا خوف عظمت الٰہی سے (۶) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بخار آ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھبرائے ہوئے دولت خانہ پر تشریف لائے اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے جب کچھ افاقہ ہوا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان فرمایا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو تورات وانجیل کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے وحی کا قصہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کی اور یہ بھی کہا کہ افسوس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے ایک دن نکالے گی۔ اگر میں زندہ رہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری مدد کروں گا۔ غرض ہر طرح

(۱) ایک قلبی کیفیت کا نام ہے واردات کا انقطاع جو کسی مصلحت سے ہوتا ہے قبض محبوب (اللہ) کی تجلی جلالی یعنی آثار عظمت واستغناء کے فی الحال وارد ہونے سے قلب کا گرفتہ ہونا قبض کہلاتا ہے۔ اور قبض کے مقابل حالت بسط ہے یعنی آثار لطف وفضل کے ورود سے قلب کو مسرور وفرحت ہونا (۲) بدن کی صفائی ہو گئی (۳) پسندیدہ چیز ہے (۴) جسم سے فاسد مادہ نکل گیا (۵) وحی کا بوجھ (۶) وحی کے بوجھ یا اللہ کی عظمت کے خوف سے۔

آپ کو معلوم ہو گیا کہ میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوا ہوں۔

قبض میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال

اس کے بعد تین سال تک وحی منقطع ہوگئی(۱)۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر پریشان تھے کہ بعض دفعہ پہاڑ پر چڑھ کر ارادہ کرتے کہ یہاں سے گرا کر اپنے کو ہلاک کردوں، یہ قبض ہی کی حالت تھی۔ اسی کو مولانا نے فرمایا ہے:

بردل سالک ہزاراں غم بود گر زباغ دل خلالے کم بود(۲)

آپ اشتیاق وحی (۳) میں بے چین تھے اور اس بے چینی میں کسی وقت اپنے کو ہلاک کرنے کا قصد فرماتے تھے کہ فوراً حضرت جبرائیل علیہ السلام ظاہر ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرماتے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ''ابدا افضل ما صلی علی احد من خلقه ۱۲''(۴)

آپ اس امت کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنایا ہے تو جب قبض میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی تو دوسرا کون ہے جو اس پر راضی ہو اور ذرا بھی پریشان نہ ہو، ہاں اس پر رضا اس طرح ہوجاتی ہے کہ اس کے مصالح ومنافع کے استحضار سے کسی قدر قلب کو شگفتگی ہوجاتی ہے(۵) پھر ان مصالح کا علم کبھی تو اجمالی ہوتا ہے جس کو مولانا نے ان اشعار میں بیان فرمایا ہے:

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو آں صلاح تست آیں دل شو(۶)

محقق کے ارشاد سے اجمالاً معلوم ہو گیا کہ قبض میں بھی مصالح ہوتی ہیں(۷)۔ یہ کوئی بری حالت نہیں جس سے سالک خواہ مخواہ اپنے کو مردود(۸) سمجھنے لگے اور فرماتے ہیں:

---

(۱) نزول وحی کا سلسلہ بند ہو گیا (۲) ''سالک کے دل پر ہزاروں غم وارد ہوتے ہیں، اگر اپنی قلبی حالت میں ذرہ بھر بھی کمی پاتا ہے'' (۳) نزول وحی کے شوق میں (۴) ''رحمت بھیجے اللہ تعالیٰ آپ پر ہمیشہ افضل رحمت جو اللہ تعالیٰ اپنی کسی مخلوق پر بھیجتے ہیں'' (۵) اس کے فوائد کو سوچ کر دل مطمئن ہوجاتا ہے (۶) ''جب تجھ کو قبض پیش آئے ناامید مت ہو وہ تیری مصلحت کے لیے ہے'' (۷) حالت قبض میں بہت سی مصلحتیں ہیں (۸) راندہ درگاہ۔

چونکہ قبض آید تو دروے بسط بیں تازہ باش وچیں میفگن برجبیں(۱)

قبض میں مصلحت

اس میں یہ بتلادیا کہ قبض کے بعد بہت قوی ہوا ہے۔ یہ کلمہ دراصل ایسا ہے جیسے ''اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ''(۲) میں کلمہ مع بمعنی بعد تم اس کا خیال کرکے شاداں وفرحان رہو پریشان نہ ہو۔ یہ تو اجمالی مصالح ہیں اور کبھی بعض مصالح کا تفصیلی علم بھی ہوجاتا ہے تو اس سے پوری تسلی ہوجاتی ہے مثلاً کبھی قبض میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ بعض اوقات سالک پر بسط کی حالت میں کسی وارد کے عطا ہونے سے ایک ناز کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اس وقت اگر حق تعالیٰ دستگیری نہ فرمائیں تو یہ کبروعجب میں مبتلا ہوکر تباہ وبرباد ہوجائے۔ حق تعالیٰ نے اس کی یوں دستگیری فرمائی کہ قبض طاری کردیا اور ساری کیفیات وواردات کو سلب(۳) فرمالیا۔ اب اس کی یہ حالت ہے کہ بجائے ناز وانداز کے یوں دیکھتا ہے کہ میں ساری دنیا سے زیادہ ذلیل ہوں اور اس وقت سچ مچ اس کو اپنے سے زیادہ ذلیل وحقیر کوئی نظر نہیں آتا۔ چنانچہ ایک سالک نے قبض کی حالت میں مجھ سے یہ بیان کیا کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں فرعون وہامان سے بھی بدتر ہوں۔ یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی اور جب تک انسان ایسا ہی نہ بن جائے اس وقت تک اہل دل کا کلام سمجھ میں آ بھی نہیں سکتا۔

سالک کا حال

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عارف اس وقت تک عارف نہیں ہوتا جب تک اپنے کو کافر فرنگ سے بدتر نہ سمجھے۔ صاحب سالک پر واقعی ایسی حالت گزرتی ہے کہ وہ سچ مچ تمام مخلوق سے اپنے کو بدتر سمجھتا ہے۔ خیر اگر کسی پر یہ حالت نہ گزری ہو تو وہ اس کلام کو انجام ہی کے اعتبار سے سمجھ لے کہ نہ معلوم میرا انجام کیسا ممکن ہے کہ کافر فرنگ کا انجام مجھ سے اچھا ہوجائے کیونکہ حالت یہ ہے کہ

(۱) ''جب تجھ کو قبض پیش آئے تو اس میں بسط کا مشاہدہ کرکے خوش وخرم ہو اور پیشانی پر بل نہ ڈال''
(۲) ''یقیناً دشواری کے بعد آسانی'' (۳) واردات کی اس کیفیت کو ختم کردیا۔

گہ رشک برد فرشتہ برپا کی ما گہ خندہ زند دیوز ناپاکی ما
ایماں چو سلامت بہ گو بریم تحقیق شود پاکی و ناپاکی ما(۱)

تو اپنے دل کو یہی سمجھنا چاہیے کہ انجام معلوم ہونے سے پہلے مجھے کیا حق ہے کہ اپنے کو کسی سے افضل اور اچھا سمجھوں (اور اگر سب سے بدتر ہونا بھی متیقن نہیں مگر محتمل تو ہے اور احتمال کی بناء پر اپنے کو اچھا سمجھنا مضر اور برا سمجھنا مفید ہے بشرطیکہ یاس کا درجہ نہ ہو اس لیے اپنے کو سب سے برا ہی سمجھنا چاہیے ۱۲ ظ)

یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے

ایک شخص نے مجھ سے یہ پوچھا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے، میں نے کہا جائز ہے اگر یہ اطمینان ہو کہ ہم اس سے اچھی حالت میں مریں گے، تو واقعی ہمیں کسی سے اپنے کو اچھا سمجھنے کا کیا حق ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ انجام کی کچھ خبر ہی نہیں ہے کہ کیا ہوگا۔ خوب کہا ہے:

غافل مرد کہ مرکب مردان مردرا در سنگلاخ بادیہ پیما بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند (۲)

خود کو حقیر سمجھنے کی صورتیں

تو صوفیاء کے اس کلام کی ایک موٹی سی توجیہ تو یہی ہے کہ خاتمہ کا خیال کر کے اپنے کو حقیر وذلیل سمجھتا رہے لیکن یہ تو عقل کے سمجھنے کے واسطے توجیہ ہے اور اہل حال تو خاتمہ کے خیال سے قطع نظر کر کے بھی حالت موجودہ ہی میں اپنے کو سب سے بدتر سمجھتے ہیں، باقی اس کو میں سمجھا نہیں سکتا۔ بس ایک حالت ہے جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست گفتم کہ چوما شوی بدانی (۳)

بس اس وقت تو تقلیداً مان لیا جائے کہ سالکین پر ایسی حالت گزرتی ہے جیسا کہ ہمارے ایک دوست نے کہا تھا کہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں فرعون وہامان سے

(۱) ''کبھی فرشتہ ہماری پاکی پر رشک کرتا ہے اور کبھی ہماری ناپاکی پر شیطان بھی ہنستا ہے، ایمان اگر قبر تک سالم لے جائیں تو ہماری پاکی اور ناپاکی کی تحقیق ہو'' (۲) ''غافل مت چل مرکب مردان خدا نے سنگلاخ جنگل میں راستہ قطع کیا ہے اور ناامید مت ہو کہ زندان بادہ نوش اچانک ایک ہی نالہ (ایک ہی فریاد) میں منزل مقصود کو پہنچ گئے'' (۳) ''کسی نے کہا کہ عاشقی کس کو کہتے ہیں، میں نے جواب دیا کہ جب تو ہم جیسا ہو جائے گا اس کو جان لے گا''۔

بھی بدتر ہوں تو جب بسط میں غلبہ واردات سے ناز کی سی کیفیت سالک میں پیدا ہونے لگتی ہے اس وقت حق تعالیٰ اس پر قبض طاری کر دیتے ہیں تا کہ وہ اپنی عبدیت کا مشاہدہ کرے اور اپنے کو سب سے ذلیل وحقیر سمجھنے لگے اور دعویٰ اور ناز نہ کرے تو دیکھئے یہ کتنی بڑی رحمت ہے۔ اگر اس وقت قبض وارد نہ کیا جاتا تو بسط میں تو یہ تباہ ہو جاتا کبھی قبض میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ سالک کے لیے انوار حجاب راہ بنے ہوئے تھے ذکر میں جو اس پر تجلیات وانوار کا انکشاف ہوتا تھا یہ انہی کی سیر میں مشغول ہو گیا اور انہی پر اکتفا کرنے لگا حالانکہ مقصود توجہ الی الحق ہے۔ (۱)

حجاب کی دو قسمیں

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حجاب دو قسم کے ہیں ایک حجاب ظلمانی، ایک حجاب نورانی، حجاب ظلمانی تو یہی وساوس وخطرات ہیں جو ذکر کے وقت دنیوی امور کے متعلق قلب میں آیا کرتے ہیں۔ ان پر توجہ کرنا تو ظاہر ہے کہ مضر ہے (۲) اور حجاب نورانی یہ ہے کہ عالم ملکوت کے انوار وتجلیات مکشوف ہوں (۳) وہ بھی ایک عالم ہے جو کہ غیر خدا ہے اس لیے اس کی کیفیات پر بھی توجہ نہ کرنا چاہیے۔ حضرت حاجی صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ حجاب نورانی ظلمانی سے اشد ہے (۴) کیونکہ اس میں بوجہ نورانی ہیئت کے زیادہ مشغولیت ہوتی ہے۔ دوسرے وہ ایک نئی سی چیز ہے اس کو دیکھ کر سالک سمجھتا ہے کہ میں کامل ہو گیا حالانکہ وہ ہنوز غیر حق کے ساتھ الجھا ہوا ہے کیونکہ وہ انوار وتجلیات بھی اس کے شاغل عن الحق (حق سے پھرنے والے) ہیں اور اس کو ان میں ایک لذت بھی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ کسی وقت محجوب ہو جاتے ہیں (۵) تو بڑا رنج ہوتا ہے تو میاں اب تک اپنی لذت ہی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ مقصود تک رسائی کہاں اس وقت حق تعالیٰ قبض طاری کر کے ان انوار وتجلیات کو سلب (۶) کر لیتے ہیں تا کہ سالک غیر حق سے ہٹ کر حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور اس میں بندہ کی بڑی مصلحت ہوتی ہے ورنہ مقصود سے رہ جاتا۔ پس اگر کسی وقت تمام انوار کو چھپا دیا جائے تو

(۱) مقصود تو اللہ کی طرف توجہ ہے نہ کہ تجلیات کی طرف (۲) نقصان دہ (۳) عالم ملکوت کے انوار وتجلیات اس پر کھل جائیں (۴) سخت ہے (۵) کسی وقت نظروں سے اوجھل ہو جائیں تو غم ہوتا ہے (۶) ان انوار کو ختم کر دیتے ہیں۔

یہ حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے ایسے وقت گھبرانا نہ چاہیے۔ غرض یہ چند مثالیں ہیں تفصیلی حکمتوں کی ان کے سوا اور بھی مصلحتیں قبض میں ہوتی ہیں جو اکثر سالک کو وقت پر خود ہی معلوم ہوجاتی ہیں تو ان اجمالی یا تفصیلی حکمتوں کے استحضار سے قبض میں تسلی ہوجاتی ہے(۱) اور کچھ شگفتگی قلب میں آجاتی ہے ورنہ درحقیقت قبض تسلی کی چیز نہیں وہ تو موجب غم ہی ہوتا ہے۔ دراصل تسلی تو جب ہی ہوتی ہے جب کسی قسم کا بسط ہو (معلومات دنیا میں بھی تو یہ بات ظاہر ہے کہ مال ومتاع کا چوری ہوجانا یا لٹ جانا تو موجب رنج ہی ہے یہ اور بات ہے کہ ثواب آخرت سوچ کر یا مال جانے کے بعد جو حفاظت وگہداشت سے بے فکری ہوگئی۔ اس راحت کو مستحضر کرکے دل کو سمجھا لیا جائے مگر نفسِ مال کا چوری ہوجانا ایسی چیز نہیں کہ انسان خود اس پر طبعاً راضی ہوجائے اس سے تو ایک دفعہ تو صدمہ ہوہی گا اور اس کا تصور قائم کرلینا بھی موجب الم ہوگا(۲)۔ ہاں اس کے تصور کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں دل لگایا جائے تو کچھ تسلی ہوسکتی ہے اسی طرح قبض بھی بظاہر متاع باطن کا لٹ(۳) جانا ہے اس سے صدمہ اور پریشانی کا ہونا لازمی وطبعی امر ہے۔ گو اس کے مصالح ومنافع کی طرف قلب کو متوجہ کرکے تسلی حاصل ہوجائے(۴)۔ مگر خود نفسِ قبض پر دل راضی نہیں ہوتا نہ اپنی ذات سے تسلی کی شے ہے بلکہ جس طرح دنیا کے معاملات میں اصل تسلی کی چیز یہ ہے کہ روانہ نئی آمدنی ہوتی رہے اور ہر دن چھنا چھن روپے ہاتھ میں آتے رہیں اسی طرح باطن میں اصل تسلی کی چیز بسط ہی ہے جس میں وقتاً فوقتاً یوماً فیوماً متاع باطن(۵) کو ترقی ہوتی ہے اور جدید ولذیذ واردات ہر دم وارد ہوتے رہیں ۱۲ ظ)

بعض اہل اللہ کا حال

میں یہ کہہ رہا تھا کہ کم گناہ کرنے والوں میں جو خاص لوگ ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ گناہ پر تو وہ کیا ہی صبر کرسکتے ہیں ایک ذرا سی قلبی تغیر اور وارد کے فوت ہونے پر ہی ان کو قرار نہیں آتا اسی سے تو وہ بے چین اور پریشان ہوجاتے ہیں تو اس سے معلوم ہوا

(۱) حالت قبض میں اطمینان ہوجاتا ہے (۲) تکلیف کا باعث (۳) باطنی دولت کا لٹ جانا ہے (۴) اس کی مصلحت اور نفع کی طرف دل کو متوجہ کرنے سے تسلی ہوجائے (۵) دن بدن باطنی کیفیات میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔

کہ تھوڑے گناہ والا بہ نسبت بہت گناہ والوں کے زیادہ پریشان ہوتا ہے اور جس کے پاس بالکل گناہ نہیں وہ اس سے بھی زیادہ پریشان ہے جس کے پاس تھوڑے سے گناہ ہیں (اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے قرض لینا تو کبھی جانا ہی نہ ہو بلکہ اس سے بڑھ کر وہ ہمیشہ سے اس بات کا عادی ہو کہ اپنے پاس سو پچاس روپے ہر وقت جمع رکھتا ہے کبھی خالی ہاتھ نہیں رہتا اور ضرورت والوں کو ضرورت کے وقت دیتا دلاتا رہتا ہے۔ ایسے شخص کا اگر کبھی اتفاق سے ہاتھ خالی ہوجائے تو سمجھ لیجئے اس کو کتنی پریشانی ہوگی تھوڑے سے مقروض کو قلیل قرض سے (۱) وہ پریشانی نہ ہوگی جو اس شخص کو محض اپنا ہاتھ خالی ہوجانے سے ہوگی کیونکہ جس نے ہمیشہ دوسروں کو دیا ہو کبھی کسی سے ایک پیسہ کا ادھار نہ لیا ہو اس کو تو اس حالت کے تصور سے بھی لرزہ (۲) آئے گا کہ آج میرا ہاتھ خالی ہے اور شاید مجھے دوسروں سے مانگنا پڑے۔ اہل اللہ کی یہی حالت ہے کہ گناہ تو کیا وہ تو احتمال گناہ سے کانپتے ہیں، واردات (۳) کے کم ہوجانے سے ہی گھبرا جاتے ہیں کیونکہ اس سے کسی قدر تنزل اور بعد (۴) کا وہم سا ہوجاتا ہے ۱۲)

یہ سلسلہ کلام اس پر شروع ہوا تھا کہ تھوڑے گناہ میں غم زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ابھی اس کو گناہ کے نشتر سے تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور جو لوگ واردات کی کمی سے بھی پریشان نہ ہوں گے یہی پریشانی ہے جو سب میں مشترک ہے (۵) کسی کو اس کا زیادہ احساس ہے کسی کو کم اور جو کسی کو اپنی اس حالت پر نظر اور تاسف (۶) بھی نہ ہو تو اس کی یہ حالت خود قابل تاسف ہے (۷) اول تو اپنے گناہوں پر نظر کر کے ہم کو خود رونا چاہیے اور جو کسی کو رونا نہ آئے تو اس رونا نہ آنے پر رونا چاہیے کہ افسوس میں ایسا سنگدل ہوں کہ مجھے اپنی بدحالی پر رونا بھی نہیں آتا اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب اس کو کسی بات پر رونا نہیں آتا تو اسی پر کیوں آئے گا تو سمجھ لیجئے کہ اس رونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر رونے کی کوشش کرنی چاہیئے، چاہے رونا آئے یا نہ آئے، تو رونے کی صورت بنانی چاہیے

(۱) جس پر تھوڑا قرض ہو اس کو ایسی پریشانی نہیں ہوگی (۲) تصور سے بھی کپ کپی طاری ہو جائے گی (۳) نزول تجلیات کی کمی (۴) کیونکہ اس سے درجہ میں کمی اور اللہ سے دور ہونے کا گمان ہوتا ہے (۵) اس پریشانی میں سب شریک ہیں (۶) افسوس (۷) قابل افسوس ہے۔

اس کی دلیل حدیث ہے۔ ''فَاِنْ لَّمْ تَبْکُوا فَتَبَاکَوا'' (۱) اور اکثر قاعدہ تو یہ ہے کہ رونے کی کوشش کرنے سے رونا آہی جاتا ہے چنانچہ بہت دفعہ ایسا ہوجاتا ہے اور اگر رونا بھی نہ آئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تباکی ہی کو بکا کا بدل قرار دیدیا ہے (۲) اور جب کسی چیز کے لیے کوئی بدل ہوتا ہے تو وہاں مقصود کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو اصل وبدل میں مشترک ہو (۳) تو معلوم ہوا کہ رونے سے جو مقصود ہے وہ رونے کی کوشش کرنے سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ طبیب جب کوئی دوا لکھ کر اس کا بدل بتلاتا ہے تو وہاں اس کا مقصود ایک ایسا اثر ہوتا ہے جو دونوں دواؤں میں مشترک ہے۔ پس جب تباکی بکائے عین کا بدل ہے (۴) تو معلوم ہوا کہ بکائے عین خود مقصود نہیں بلکہ مقصود وہ چیز ہے جو اس میں اور تباکی میں مشترک ہے وہ کیا چیز ہے وہ بکاء قلب ہے (۵) جس کو دل کا رونا کہتے ہیں پس تباکی میں گو آنکھ سے رونے کی صورت نہ پائی جائے مگر رونے کی حقیقت موجود ہے یعنی دل کا رونا اور دل کا رونا کیا ہے۔ اس کی حقیقت ہے فکر اور رونج وملال (۶) تو جو شخص رونے کی کوشش کرے گا ظاہر ہے کہ وہ اس سے خالی نہ ہوگا اس لیے اس تقریر پر شبہ نہ رہا۔

اصل مقصد دل کا رونا ہے

ایک دوست مجھ سے کہنے لگے کہ حج سے آکر مجھے رونا ہی نہیں آتا گویا وہ اپنی اس حالت پر افسوس کررہے تھے، میں نے کہا کہ رونا نہ آنے پر رنج کرنا یہ بھی رونا ہی ہے۔ پہلے آپ کی آنکھ روتی تھی اس وقت اس مصرعہ کے مصداق تھے۔

اے خوشا چشمیکہ آں گریان اوست (۷)

اور اب دل روتا ہے اس وقت آپ دوسرے مصرعہ کے مصداق ہیں۔

اے خوشا آں دل کہ آن بریان اوست (۸)

---

(۱) ''اگر رونہ سکو تو رونے کی صورت ہی بنالو'' امالی الشجر اء: ۱/۹۱ (۲) رونے کی شکل بنانے کو ہی رونے کا قائم مقام کہا ہے (۳) اصل وبدل میں متحد ہو (۴) رونے کی شکل بنانا آنکھ سے رونے کا بدل ہے (۵) دل کا رونا ہے (۶) دل کے رونے کی حقیقت فکر ورنج وافسوس ہے (۷) ''وہ آنکھیں بہت اچھی ہیں جو اس کی محبت میں رونے والی ہیں'' (۸) ''وہ دل بہت اچھا ہے جو اس کی محبت میں سوختہ ہے''۔

اور اصل مقصود دل کا رونا ہے آنکھ کا رونا مقصود نہیں۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے ایک بار وعظ فرمایا تو لوگوں نے کپڑے پھاڑ دیئے۔ آپ نے فرمایا: ''لَا تَشُقُّوا جُيُوْبَكُمْ بَلْ شُقُّوا قُلُوْبَكُمْ'' یعنی گریبان چاک نہ کرو بلکہ دلوں کو چاک کرو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ گریبان چاک کرنے والے قابل ملامت ہیں بلکہ آپ کا مطلب یہ ہے کہ اصل مقصود دل کا چاک کرنا ہے اس میں سعی کرنا چاہیے اور یہ حالت جس کی وجہ سے کپڑے چاک کیے جارہے ہیں مقصود نہیں نہ یہ کچھ کمال ہے۔

معذور حضرات صاحب کمال نہیں ہوتے

پس ایسے لوگ کامل نہیں ان کو اہل کمال تو نہ سمجھیں مگر طعن بھی نہ کریں(۱) کیونکہ بعضے معذور بھی ہوتے ہیں چنانچہ اسی لیے شیخ سعدی شیرازیؒ جن کا لقب تاج الاولیاء ہے۔ فرماتے ہیں:

مکن عیب درویش حیران ومست کہ غرق ست ازاں می زندہ پاؤ دست(۲)

اس میں تو یہ تعلیم ہے کہ ان پر اعتراض نہ کرو آگے ان کی حالت بتا کر عذر ظاہر کرتے ہیں۔

بہ تسلیم سر در گریباں برند چو طاقت نماند گریباں درند(۳)

پس یہ لوگ معذور تو ہیں مگر صاحب کمال نہیں ہیں۔ ان کپڑے پھاڑنے والوں کی حکومت صرف ظاہر پر ہوتی ہے اس لیے وہ اپنے ظاہر ہی میں جو تصرف چاہتے ہیں کرڈالتے ہیں باطن پر ان کی حکومت نہیں ہوتی اور اہل کمال وہ ہیں جن کی حکومت ظاہر و باطن دونوں پر ہوتی ہے کہ وہ کسی قلبی حالت سے از جارفتہ(۴) نہیں ہوجاتے۔ وہ حالت ان پر غالب نہیں ہوتی بلکہ وہ خود حالت پر غالب ہوجاتے ہیں۔

حضرت جنیدؒ ایک صاحب کمال بزرگ

ایک دفعہ حضرت جنیدؒ مجلس میں تشریف فرما تھے، کسی نے کوئی عجیب شعر پڑھا۔

(۱) ان پر اعتراض بھی نہ کریں (۲) ''درویش حیران ومست پر طعن، تشنیع مت کرو کہ عشق میں غرق ہے اس وجہ سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے'' (۳) ''تسلیم کے ساتھ سر جھکا لیتے ہیں جب طاقت نہیں رہتی گریبان پھاڑتے ہیں'' (۴) بے خود

اس پر ایک صوفی کو سخت وجد ہوا کہ قریب بہ ہلاک ہوگیا اور سارے مجمع پر ایک کیفیت طاری ہوگئی مگر حضرت جنیدؒ ویسے ہی وقار سے بیٹھے رہے جیسے تھے ان کو ذرا تغیر نہ ہوا تو کسی نے سوال کیا کہ اے جنید! کیا تم کو اس شعر سے لطف نہیں آیا جو ذرا بھی وجد نہ ہوا تو آپ نے جواب دیا وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ۔ (۱)

مطلب یہ کہ یہ لوگ ہلکے ظرف تھے۔ ان کی حرکت سب کو نظر آ گئی اور کامل پہاڑ کی طرح ہے کہ اس کی حرکت نظر نہیں آتی۔ ظاہر میں وہ ساکن معلوم ہوتا ہے اور درحقیقت وہ بہت تیز جارہا تھا اور ذرا سی دیر میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔

بعض اکمل صحابہؓ کا حال

یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے زیادہ صاحب کمال اور انوار باطنیہ سے مالامال کون ہوا ہوگا مگر بجز ایک آدھ قصہ کے، مثلاً حضرت ابوہریرہؓ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر بیہوش ہوگئے تھے۔ باقی صحابہ سے عموماً یہ بات ثابت نہیں ہے کہ کسی نے جوش وولولہ میں کپڑے پھاڑ دیئے ہوں یا بیہوش ہوگئے ہوں یا ناچنے لگے ہوں اور اگر ایک آدھ سے کبھی اتفاقیہ بیہوش ہوجانا ثابت بھی ہے تو کن سے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ تھے، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نہ تھے۔ حالانکہ یہ حضرات اکمل الصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں تو ان کے سامنے مؤخر درجہ میں تھے۔ ان میں ایک آدھ قصہ شاذ ونادر ایسا ہوگیا، عموماً ان کی بھی یہ حالت نہ تھی۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں جو سب سے زیادہ کامل ہیں وہ سب سے زیادہ مضبوط اور مستقل مزاج ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حادثہ وصال مسلمانوں کے لیے کچھ کم جانکاہ نہ تھا (۲)۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اس پر جس قدر بھی روتے تھوڑا تھا اور نہ معلوم ہمارے سامنے یہ حادثہ ہوتا تو ہم لوگ کیا سے کیا کر ڈالتے مگر حضرات صحابہ نے بجز آنسو بہالینے اور

(۱) ''یعنی پہاڑوں کو تم (قیامت میں) ایک جگہ پر ٹھہرا ہوا دیکھو گے حالانکہ وہ ایسے تیز چلتے ہوں گے جیسے بادل چلا کرتا ہے'' النمل: ۲۷/ ۸۸ (۲) جان لیوا۔

تنہا بیٹھ کر رو لینے کے کچھ نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بظاہر صحابہ میں سب سے زیادہ مضبوط اور دلیر و مستقل مزاج نظر آتے تھے مگر اس وقت ان کی بھی یہی حالت تھی کہ حواس باختہ ہو گئے اور تلوار ہاتھ میں لے کر پکارتے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا، اس کی گردن اڑا دوں گا، آپ زندہ ہیں اور ابھی منافقین کی خبر لیں گے۔

وصال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خطبہ صدیق اکبرؓ

یہ خبر سن کر حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوڑے ہوئے عوالی سے تشریف لائے اور سیدھے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں جا پہنچے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو ہی چکا تھا۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چادر چہرہ مبارک سے ہٹائی اور بے اختیار پیشانی انور کا بوسہ لیا۔ اس وقت حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے زیادہ مضبوط نکلے، ان کی زبان سے وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یقین ہو جانے کے بعد کوئی بات نہیں نکلی سوا اس کے کہ ایک دو دفعہ اتنا کہا: وَاخَلِیْلاَہُ وَاحَبِیْبَاہُ لَقَدْ طِبْتَ حَیًّا وَمَیِّتًا وَلَاَنْتَ اَکْرَمُ عَلَی اللّٰہِ مِنْ اَنْ یُذِیْقَكَ الْمَوْتَ مَرَّتَیْنِ رواہ کمال قال (۱)۔ اس کے بعد غایت ضبط کے ساتھ حجرہ سے باہر آئے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تمام کے تمام حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے منہ کو تک رہے تھے کہ ان کے منہ سے کیا نکلتا ہے اور کیا خبر سناتے ہیں۔ حضرت صدیقؓ نے اول تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا "عَلٰی رِسْلِكَ یَا رَجُلُ" اے شخص! بس ٹھہر جا مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور برابر اپنی اس بات کو پکارتے رہے۔ اس کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سیدھے ممبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر تشریف لے گئے اور خطبہ ماثورہ کے بعد فرمایا: اَیُّھَاالنَّاسُ مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ کَانَ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لاَ یَمُوْتُ۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ ط وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْهِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا ط وَسَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ۔ اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ۔

(۱) "ہائے خلیل ہائے محبوب آپ زندگی میں خوشبودار تھے، موت میں بھی خوشبودار ہیں اور آپ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اکرم اس بات سے کہ دو مرتبہ موت کا ذائقہ چکھیں"۔

یعنی اے لوگو! جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معبود سمجھتا ہو تو وہ سن لے کہ آپ کا تو وصال ہو گیا اور جو خدا تعالیٰ کو معبود سمجھتا ہو اس کی عبادت کرتا ہو تو وہ سن لے کہ خدا حَیٌّ لا یموت ہے وہ کبھی نہ مرے گا۔ اس کے بعد یہ آیت پڑھی: ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ'' جس کا ترجمہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک رسول ہی تو ہیں ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم مرجائیں یا قتل ہو جائیں تو تم دین حق سے الٹے پاؤں ہٹ جاؤ گے اور جو اس طرح ہٹے گا وہ خدا تعالیٰ کو کچھ بھی نقصان نہ دے گا (اپنا نقصان کرے گا) اور حق تعالیٰ (ایسے وقت میں) شکر وحمد کرنے والوں کو جزا دیں گے اور یہ آیت بھی پڑھی ''اِنَّكَ مَيِّتٌ'' جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہیں کہ آپ بھی ایک دن مرنے والے ہیں اور یہ کفار بھی پھر تم سب قیامت کے دن اپنا جھگڑا خدا کے پاس لے جاؤ گے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو یہ مضمون اور یہ آیتیں سنیں تو سمجھ گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو چکا۔ اب ان سے کھڑا ابھی نہ ہوا گیا، مارے غم کے تلوار ٹیک کے بیٹھ گئے اور رونے لگے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہمارے ذہن سے اس وقت بالکل غائب ہوگئی تھی جس وقت حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر ان کو پڑھا ہے۔ تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابھی اتر رہی ہے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر تھوڑی ہی دیر میں سب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سنبھل گئے اور دین کے کاموں میں مشغول ہوگئے مگر جیسے حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ افضل الصحابہ تھے ویسے ہی اس وقت سب سے زیادہ صاحب ضبط واستقلال بھی نکلے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا ایک عجیب واقعہ استقلال

ایک واقعہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے استقلال کا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کچھ قبائل عرب مرتد ہوگئے تھے جن میں کچھ تو مسیلمہ کذاب وغیرہ مدعیان نبوت کے ساتھ ہوگئے اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے بلکہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتے رہے تو حید ورسالت کے مقر رہے کہ کعبہ کو قبلہ مانتے رہے، نماز کی فرضیت کے قائل رہے مگر زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر ہوگئے اور یہ کہا کہ فرضیت زکوٰۃ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے

مخصوص تھی اب فرض نہیں اور علت یہ بتلائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا اس لیے اس وقت زکوٰۃ کی ضرورت تھی۔ اب وہ حالت نہیں رہی اس لیے فرضیت بھی باقی نہیں رہی۔ جیسے آج کل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلیں کیا کرتے ہیں۔ پہلی جماعت کے بارے میں سب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ جہاد کیا جائے۔

مگر دوسری جماعت کے حق میں سب کی رائے نرم تھی حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھی یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے اور جو کھلے کافر ہیں صرف ان سے لڑائی کی جائے ان لوگوں سے جہاد نہ کیا جائے۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے اس دوسری جماعت کے متعلق بھی وہی تھی جو اور مرتدین کے متعلق تھی وہ ان لوگوں کو کافر کہتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے کہ یہ لوگ تو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہیں ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں ان پر کیونکر جہاد ہوسکتا ہے اور ان کو کفار کی طرح کیسے قتل کیا جاسکتا ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ سب کچھ سہی، مگر یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں (کہ نماز کو تو فرض مانتے ہیں اور زکوٰۃ کو فرض نہیں مانتے حالانکہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے تو یہ لوگ فرض قطعی کے منکر ہیں) اور ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مَنْ بَدَّلَ دِیْنَہٗ فَاقْتُلُوْہُ'' (جو شخص آپ کے دین کو بدل دے پس اس کو قتل کردو) اس لیے میں ان کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پھر کہا کہ آپ کلمہ گو آدمیوں سے کیسے قتال کریں گے۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''اَجَبَّارٌ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ وَخَوَّارٌ فِی الْاِسْلَامِ وَاللّٰہِ لَوْ مَنَعُوْنِیْ وَفِیْ رِوَایَۃٍ عِنَاقًا عِقَالاً کَانُوْا یُؤَدُّوْنَہٗ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاُقَاتِلَنَّھُمْ عَلَیْہِ''(۱)

(۱) ''اے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ! یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بودے ہوگئے، بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا ایک بکری کے بچے کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا''۔

اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی ''اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا'' (یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت میں بھی تھا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں اگر میں تنہا بھی جہاد کو نکل کھڑا ہوں گا تو خدا میرے ساتھ ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ میں تمام دنیا پر غالب آؤں گا، کیا انتہا ہے اس وقت قلب کی۔ چنانچہ پھر سب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے پر متفق ہوگئے اور بعد میں اقرار کیا کہ اس وقت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہم لوگوں کو سنبھالا ورنہ ہم گمراہی میں پڑ چکے تھے کہ ان لوگوں کو مسلمان سمجھے تھے (۲)۔

اس واقعہ سے حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے استقلال وقوت قلب (۳) کا بخوبی یہ پتہ چلتا ہے کہ تمام صحابہ کے اختلاف کرنے پر بھی وہ تنہا اس جماعت کے مقابلہ پر آمادہ رہے۔ غرض صحابہ میں جو سب سے افضل تھے وہ سب سے زیادہ مستقل اور قوی القلب تھے (۴) اور یہ بات تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں تھی کہ وہ غلبہ حالات وکیفیات سے کبھی مغلوب نہ ہوتے تھے اسی لیے نہ وہ کبھی وجد میں رقص کرتے تھے نہ کپڑے پھاڑتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کپڑے پھاڑنے والے گو معذور ہوں گے مگر صاحب کمال نہیں، کامل کو ضبط کیفیت پر پوری قدرت ہوتی ہے۔

(۲) کتب احادیث وتاریخ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوچکی ہے کہ مانعین زکوٰۃ کے مرتد ہونے پر حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اجماع کرلیا تھا باوجود یکہ اپنے کو مسلمان کہتے اور نماز پڑھتے تھے اور جماعت اسلام کو چھوڑ کر کفار کے ساتھ نہ ملے تھے تو یہاں سے ایک مدعی مقتدایہ سے اہل حدیث کی غلطی واضح ہوگئی جو اس زمانہ میں جماعت قادیانی کے متعلق اسی نے کی ہے تو وہ کہتا ہے کہ شریعت میں مرتد وہ ہے جو جماعت اسلام کو چھوڑ کر کفار میں جاملے اور جو ایسا نہ کرے بلکہ اپنے کو مسلمان کہے وہ مرتد نہیں اس لیے قادیانی جماعت مرتد نہیں کیونکہ وہ اپنے کو حلقہ بگوش اسلام کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جماعت بہت سی ضروریات اسلام کا صریح انکار کرتی ہے اس لیے اس کی وہی شان ہے جو مرتدین مانعین زکوٰۃ کی تھی بلکہ اس سے بڑھ کر وہ قادیانی کو نبی کہتے ہیں تو اب اس کی وہ شان ہے جو مسیلمہ کذاب کے متبعین کی تھی۔ کیونکہ مسیلمہ کذاب اور اس کے متبعین بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے منکر نہ تھے اور بعض لوگ قادیانی کو نبی نہ کہیں مگر ولی اور مجدد کہتے ہیں حالانکہ وہ صریح کافر ہے۔ بیشمار کفریات اس کے اقوال میں موجود ہیں اور کافر کو ولی یا مجدد کہنا بھی کفر ہے اس لیے جماعت قادیانی کے سب فرقے مرتد ہیں۔ ظفر احمد عثمانیؒ) (۳) مستقل مزاج ہونے اور مضبوط دل والا ہونے کا علم ہوتا ہے (۴) مضبوط دل۔

ہمارے مشائخ میں حضرت شیخ عبدالحق ردولوی قدس اللہ سرہ کا ارشاد ہے:

منصور بچہ بود کہ از بیک قطرہ بفریاد آمد
ایں جا مرد انند کہ دریا ہا فرد برند و آروغ نزنند(۱)

ان حضرات کا دریا وجد یا رقص یا سطح کی صورت سے نہیں بہتا البتہ ان کا دریا دوسری راہ سے نکلتا ہے یعنی افادیت ونفع رسانی کی (۲) راہ سے کہ وہ اپنے جوش وخروش کو طالبین کی توجہ میں صرف کرتے ہیں جس سے ہزارہا مخلوق درجہ ولایت پر پہنچ جاتی ہے یا اگر کبھی بہت ہی غلبہ ہوا تو ان کا دریا آنسوؤں کی راہ سے بھی کسی وقت بہہ نکلتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں یک قطرہ آب خوردم ودریا گریستم (۳)

یہ حضرات بڑے عالی ظرف ہوتے ہیں بہت ضبط کرتے ہیں ہاں کبھی ضبط پورا نہ ہوسکا تو آنکھوں سے آنسو بہالیتے ہیں اور یہ نقص نہیں، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ نماز میں بعض دفعہ آپ روتے تھے تو سینے سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے ہنڈیا پکتی ہو۔ الغرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو لوگ چلّاتے چیختے اور کپڑے پھاڑتے ہیں وہ اہل کمال نہیں ہیں۔ اسی لیے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''لَا تَشَقُّوْا جُیُوْبَکُمْ بَلْ تَشَقُّوْا قُلُوْبَکُمْ''(۴)

ہاں صاحب حال ہیں اسی واسطے شیخ سعدی ان پر ملامت وطعن سے منع فرماتے ہیں:

مکن عیب درویش حیران ومست کہ غرق است ازاں مے زند پاؤ دست(۵)

کیونکہ صاحب حال معذور ہوتا ہے مگر آج کل لوگ اسی کو کمال سمجھتے ہیں کہ بات بات پر وجد آئے، رقت طاری ہو، کپڑے پھاڑنے لگیں تو خوب سمجھ لو کہ یہ کمالات نہیں ہاں حالات ہیں اور حالات بھی ایسے جو مطلوب ہیں نہ مذموم کیونکہ حالات مطلوبہ تو

(۱) ''یعنی منصور طریق سلوک میں بچے تھے کہ ایک قطرہ پی کر فریاد کرنے لگے اور جوش میں آکر انا الحق کہہ بیٹھے اور یہاں مرد ہیں کہ دریا کے دریا پی جائیں اور ڈکار تک نہ لیں'' (۲) لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے ذریعہ (۳) ''اے اللہ چشمہ محبت کیسا چشمہ ہے کہ اس کا میں نے ایک قطرہ پیا اور آنسوؤں کا دریا ہوگیا'' (۴) ''اپنے دامنوں کو نہ پھاڑو اپنے دلوں کو چیرو'' (۵) ''درویش حیران ومست یعنی صاحب کمال پر لعن طعن مت کرو اس لیے کہ وہ محبت میں غرق ہے اس وجہ سے ہاتھ پیر مارتا ہے''۔

وہی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے مشابہ ہوں۔ جتنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشابہت ہوگی اتنا ہی زیادہ کمال ہوگا، باقی کیفیات نہ ضروری ہیں نہ کمال (گو مضر بھی نہیں بلکہ ان کا وجود علامت ہے تاثیر ذکر کی) اسی لیے میں نے کہا تھا کہ اصل مقصود دل کا رونا ہے، آنکھ کا رونا اصل مقصود نہیں کیونکہ حدیث میں آچکا ہے: ''فَاِنْ لَّمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكُوْا''(۱) اگر بکا ہی (۲) مقصود ہوتا تو رونے کی کوشش کرنا اس کا قائم مقام نہ ہوتا بہر حال ہم لوگوں کی حالت قابل اصلاح ضرور ہے اور جو لوگ گناہوں میں کم مبتلا ہیں ان کو بھی اس حالت پر تاسف (۳) ہونا چاہیے۔ اور جس کو تاسف نہ ہو اس کو اس تاسف نہ ہونے پر تاسف ہونا چاہیے (۴)۔ خاص کر جب یاددہانی کی جائے کیونکہ بعض دفعہ خود اپنی کسی حالت پر تاسف نہیں ہوتا مگر دوسرے کی تنبیہ سے خیال پیدا ہوجاتا ہے مگر خیر غنیمت ہے کہ جن لوگوں کو اپنی بدحالی پر تاسف بھی نہیں ہے وہ بھی اپنی بدحالی کے مقر تو (۵) ضرور ہیں کیونکہ گناہ گار ہونے کا ہر شخص کو اقرار ہے تو مرض کا احساس تو سب کو ہے مگر کوتاہی یہ ہے کہ علاج کی فکر نہیں اور ظاہر ہے کہ مرض کا علاج نہ کرنا سخت خطرناک ہے تو علاج ڈھونڈنا ضروری ہوا۔ سو اس آیت میں جس کی میں نے تلاوت کی ہے اس مرض عام کا علاج موجود ہے۔ اسی لیے اس کو بیان کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو بھول جانا مسلمانوں کی محبت سے بعید ہے

میں اول ترجمہ کرتا ہوں اس کے بعد مقصود کی توضیح کروں گا (۶) حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ان لوگوں کی مثل نہ ہوجاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کا کیسا لحاظ فرماتے ہیں کہ یوں نہیں فرمایا: ''وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ''(۷) کیونکہ آیت کے مخاطب مسلمان ہیں (اور خدا کے بھولنے والے کافر ہیں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس طرح خطاب کرنا گوارا نہیں فرمایا کہ تم خدا کے بھولنے والے نہ بن جانا بلکہ یہ فرمایا کہ دیکھو بھولنے والوں کے مشابہ نہ ہوجانا اس میں جس قدر عنایت

(۱) ''اگر رونا نہ آتا ہو تو رونے کی کوشش کرو'' امالی الشجر اء: ۱/ ۹۱ (۲) رونا (۳) افسوس (۴) افسوس نہ ہونے پر افسوس ہونا چاہئے (۵) اقرار تو کرتے ہیں (۶) اس کے بعد مقصود کو واضح طور پر بیان کروں گا (۷) ''تم ان لوگوں میں سے نہ ہوجاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں''۔

اور لطف ہے(۱) ظاہر ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کو بھول جانا تو تمہاری محبت سے بعید ہے۔ ہاں بھولنے والوں کی طرح ہوسکتے ہو تو ہم تم سے کہتے ہیں کہ تم ایسے بھی نہ ہونا اس لیے ''لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ ''(۲) فرمایا۔

دوسرے یہ بھی اس میں نکتہ ہوسکتا ہے کہ خدا کا بالکل بھولنے والا کافر ہے اور آیت کے مخاطب مسلمان ہیں اور مسلمان کافر نہیں ہوسکتا اس لیے مسلمانوں کو'' لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ ''(۳) کے ساتھ خطاب ہو بھی نہیں سکتا بلکہ ان کو تو'' لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ ''(۴) کے ساتھ خطاب ہوسکتا ہے۔

مسلمان کبھی کافر نہیں ہوسکتا

اس پر مجھے حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات یاد آئی۔ مولانا فرماتے تھے کہ جو مسلمان ہوگیا وہ کافر کبھی نہیں ہوسکتا ہے اور یہ جو بعضے مسلمان آریہ وغیرہ ہوجاتے ہیں وہ حقیقت میں مسلمان ہی نہ تھے ان کو ایمان نصیب ہی نہیں ہوا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتا ہو اور اس کے دل میں ایمان نہ ہو کیونکہ زبانی دعوے سے دل میں ایمان کا ہونا لازم نہیں تو ممکن ہے کہ ایک مدعی اسلام عنداللہ مسلمان نہ ہو بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جو لوگ مرتد ہوتے ہیں وہ عندالناس بھی مسلمان نہیں تھے اور ہم لوگوں کا ان کو مسلمان سمجھنا محض حسن ظن پر مبنی تھا کہ نیک گمان کی وجہ سے ہم نے ان کی حالت میں غور نہیں کیا اور اگر دعویٰ اسلام کی حالت ہی میں ان کے اقوال وافعال کو غور سے دیکھا جاتا تو ہم کو بھی معلوم ہوجاتا کہ ان کو ایمان نصیب نہیں ہوا۔

ایک عجیب عبرت انگیز حکایت

چنانچہ میں آپ کو ایک عجیب عبرت انگیز حکایت سناتا ہوں جو میں نے مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ شیخ دہان (تاجر روغن) نے جو مکہ مکرمہ کے ایک بڑے عالم تھے، فرمایا کہ مکہ مکرمہ میں ایک عالم کا انتقال ہوا اور

(۱) مہربانی وکرم کا اظہار ہے (۲) ''تم ان لوگوں کے مشابہ نہ ہوجاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں'' (۳) ''ان لوگوں میں سے نہ ہوجاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں'' (۴) ''تم ان لوگوں کی مثل نہ ہوجانا جو اللہ کو بھول گئے ہیں''۔

ان کو دفن کر دیا گیا، کچھ عرصہ کے بعد کسی دوسرے شخص کا انتقال ہوا تو اس کے وارثوں نے ان عالم صاحب کی قبر میں ان کو دفن کرنا چاہا مکہ مکرمہ میں یہ دستور ہے کہ ایک قبر میں کئی کئی مُردوں کو دفن کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان عالم صاحب کی قبر کھودی گئی تو دیکھا کہ ان کی لاش کے بجائے ایک نہایت حسین لڑکی کی لاش رکھی ہوئی ہے اور صورت دیکھنے سے وہ لڑکی یورپین معلوم ہوتی تھی۔ سب کو حیرت ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے، اتفاق سے اس مجمع میں یورپ سے آنے والا ایک شخص بھی موجود تھا اس نے جو لڑکی کی صورت دیکھی تو کہا میں اس کو پہچانتا ہوں یہ لڑکی فرانس کی رہنے والی اور ایک عیسائی کی بیٹی ہے یہ مجھ سے اردو پڑھتی تھی اور در پردہ مسلمان ہوگئی تھی، میں نے اس کو دینیات کے چند رسالے بھی پڑھائے تھے۔ اتفاق سے بیمار ہوکر انتقال کر گئی اور میں دل برداشتہ ہوکر نوکری چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس کے یہاں منتقل ہونے کی وجہ تو معلوم ہوگئی کہ مسلمان اور نیک تھی لیکن اب یہ بات دریافت طلب ہے کہ ان عالم صاحب کی لاش کہاں گئی، بعض لوگوں نے کہا کہ شاید عالم کی لاش اس لڑکی کی قبر میں منتقل کر دی گئی اس پر لوگوں نے اس سیاح سے کہا کہ تم حج سے واپس ہوکر یورپ جاؤ تو اس لڑکی کی قبر کھود کر ذرا دیکھنا کہ اس میں مسلمان عالم کی لاش ہے یا نہیں اور کوئی صورت شناس بھی ساتھ کر دیا۔ چنانچہ وہ شخص یورپ واپس گیا اور لڑکی کے والدین سے اس کا یہ حال بیان کیا اس پر ان کو بڑی حیرت ہوئی کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ لڑکی کو دفن تو کیا جائے فرانس میں اور تم اس کی لاش مکہ مکرمہ میں دیکھ لو۔ اخیر رائے یہ قرار پائی کہ اس لڑکی کی قبر کو کھودو۔ چنانچہ اس کے والدین اور چند لوگ اس حیرت انگیز معاملہ کی تفتیش کے لیے قبرستان چلے اور لڑکی کی قبر کھودی گئی تو واقعی اس کے تابوت میں اس کی لاش نہ تھی بلکہ اس کے بجائے وہ مسلمان عالم قطع صورت وہاں دھرے ہوئے تھے جن کو مکہ مکرمہ میں دفن کیا گیا تھا۔ شیخ دہان نے فرمایا کہ اس سیاح نے کسی ذریعہ سے ہم کو اطلاع دی کہ اس عالم کی لاش یہاں فرانس میں موجود ہے۔ اب مکہ مکرمہ والوں کو فکر ہوئی کہ لڑکی کا مکہ پہنچ جانا تو اس کے مقبول ہونے کی علامت ہے اور اس کے مقبول ہونے کی وجہ بھی معلوم ہوگئی مگر اس عالم کا مکہ مکرمہ سے کفرستان میں پہنچ جانا کس بنا پر ہوا اس کے مردود ہونے کی کیا وجہ

ہے۔سب نے کہا کہ انسان کی اصلی حالت گھر والوں کو معلوم ہوا کرتی ہے۔اس کی بی بی سے پوچھنا چاہیے چنانچہ لوگ اس کے گھر گئے اور دریافت کیا کہ تیرے شوہر میں اسلام کے خلاف کوئی بات تھی اس نے کہا کچھ بھی نہیں وہ تو بڑا نمازی اور قرآن کا پڑھنے والا تہجد گزار تھا۔لوگوں نے کہا سوچ کر بتلاؤ کیونکہ اس کی لاش دفن کے بعد مکہ مکرمہ سے کفرستان میں پہنچ گئی ہے کوئی بات اسلام کے خلاف اس میں ضرور تھی اس پر بی بی نے کہا ہاں میں اس کی ایک بات پر ہمیشہ کھٹکتی تھی وہ یہ کہ جب وہ مجھ سے مشغول ہوتا اور فراغت کے بعد غسل کا ارادہ کرتا تو یوں کہا کرتا تھا کہ نصاریٰ کے مذہب میں یہ بات بڑی اچھی ہے کہ ان کے یہاں غسل جنابت فرض نہیں،لوگوں نے کہا بس یہی بات ہے جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے اس کی لاش کو مکہ مکرمہ سے اسی قوم کی جگہ پھینک دیا جن کے طریقہ کو وہ پسند کرتا تھا۔حضرات آپ نے دیکھا کہ یہ شخص ظاہر میں عالم متقی اور پورا مسلمان تھا مگر تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں ایک بات کفر کی موجود تھی کہ وہ کفار کے ایک طریقے کو اسلامی حکم پر ترجیح دیتا تھا اور استحسان کفر کفر ہے(۱)۔اس لیے وہ شخص پہلے ہی سے مسلمان نہ تھا۔یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ لاش منتقل ہوجایا کرے۔مگر خدا تعالیٰ کہیں ایسا بھی کر کے دکھلا دیتے ہیں تا کہ لوگوں کو عبرت ہو کہ بدحالی کا نتیجہ یہ ہے۔اس لیے میں کہتا ہوں کہ جو کافر ہوتا ہے اس میں اول ہی سے کوئی بات کفر کی ہوتی ہے جو تفتیش اور غور کے بعد ہم کو بھی معلوم ہوسکتی ہے مگر ہم غور نہیں کرتے اس لیے کہہ دیتے ہیں کہ مسلمان آریہ ہوگیا حالانکہ وہ پہلے ہی سے آریہ تھا اس میں اسلام تھا ہی نہیں مگر ہم کو اس کی بدحالی کا علم نہ تھا ورنہ جو مسلمان ہوگا وہ کبھی کافر نہیں ہوسکتا اسی لیے شیطان کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ کہ وہ پہلے ہی کافروں میں سے تھا سجدہ آدم علیہ السلام سے انکار کرنے کے وقت ہی کافر نہیں ہوا جس کا راز اہل تحقیق نے اس طرح فرمایا کہ

در لوح بدنوشتہ کہ ملعون شود یکے بردم گماں بہر کس وبرخود گماں بنود
آدم زخاک بود ومن از نور پاک او گفتم منم بگانہ وا وخود بگانہ بود

یعنی لوح محفوظ میں پہلے ہی سے لکھا ہوا تھا کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے

(۱) کفر کی کسی حالت کو اچھا سمجھنا بھی کفر ہے یہ بیماری آج کل عام ہے۔

وقت ایک شخص کافر ہوگا (یعنی اس وقت اس کا کفر ظاہر ہوگا ۱۲) اور شیطان لوح محفوظ کو پڑھ کر اس واقعہ سے باخبر تھا کہ ایک شخص کافر ہونے والا ہے۔ مگر اس کو کبھی اپنے متعلق یہ احتمال نہ ہوا کہ شاید وہ میں ہی ہوں وہ اپنی طاعت وعبادت کی وجہ سے بے فکر تھا کہ بھلا اتنا بڑا عابد کبھی کافر ہوسکتا ہے ہرگز نہیں یہ کوئی اور شخص ہوگا۔ اس تکبر اور بے فکری ہی نے اس کو تباہ کیا (ورنہ ملائکہ کی یہ حالت تھی کہ اس خبر کو دیکھ کر سب کے سب تھراتے تھے(۱) کہ دیکھئے کس کی کم بختی آنے والی ہے اس تواضع اور خشیت ہی سے وہ مقبول ومکرم رہے)

عجب و پندار کے لیے مردودیت لازم ہے

حاصل راز کا یہ ہوا کہ اس کا عجب و پندار اساس تھی (۲) کفر کی اور وہ اس میں پہلے ہی سے تھا جس کے لیے مردودیت لازم ہے۔ غرض شیطان پہلے ہی سے مقبول نہ تھا اس لیے مردود ہوگیا ورنہ جو مقبول ہوجاتا ہے وہ کبھی مردود نہیں ہوتا جیسے بالغ کبھی نابالغ نہیں ہوتا مگر یہ بھی خبر ہے کہ بالغ کون ہے۔ ہر زبان سے دعویٰ اسلام کرنے والا بالغ نہیں بلکہ بالغ وہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

خلق اطفالند جز مست خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا(۳)

یعنی جس نے اسلام کے بعد حکم الٰہی کے سامنے اپنی ہوا وہوس کو فنا کردیا ہو وہ بالغ ہے باقی سب نابالغ ہیں۔ بس جو شخص اسلام سے مرتد ہوکر اپنا نابالغ ہونا ظاہر کرتا ہے وہ ابھی تک بالغ ہوا نہیں بلکہ اس وقت تک نابالغ تھا۔

ایمان کی حالت

حدیث میں بھی تو ہے کہ ہرقل نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کے اسلام لانے سے پہلے دریافت کیا تھا کہ کیا اس دین کو اختیار کرکے کوئی شخص کراہت کے ساتھ اس کو چھوڑتا بھی ہے۔ حضرت ابوسفیان نے کہا نہیں ہرقل نے اس پر کہا: ''وَكَذٰلِكَ الْاِيْمَانُ اِذَا خَالَطَ بَشَاشَةَ الْقُلُوْبِ'' یعنی ایمان کی یہی حالت ہوتی

(۱) ڈرتے اور کانپتے تھے (۲) خود پسندی وتکبر بنیاد تھی (۳) ''بجز مست (عاشق) الٰہی کے تمام مخلوق (گویا) اطفال ہیں۔ پس بالغ وہی ہے جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ گیا''۔

ہے کہ جب وہ قلوب میں پیوستہ ہوجاتا ہے پھر نہیں نکلتا کیونکہ ایمان ایک عشق ہے اور عشق اگر سچا ہو تو کبھی دل سے نہیں نکلتا حتی کہ مرنے کے بعد بھی نہیں نکلتا جیسے کہ اگر کسی کو غیر اللہ سے محبت ہوجائے تو وہ بھی مر کر نہیں جاتی۔ اسی کو کہا ہے:

فرتم اندرتہ خاک انس بتانم باقی ست (۱)

اسی لیے اہل اللہ اپنے دل میں کسی جائز محبت کو بھی جمنے نہیں دیتے کیونکہ مرنے کے وقت اس محبوب کا خیال آئے گا اور ان کا اصل مدعا یہ ہے کہ جب دنیا سے جائیں تو اس وقت کسی کی محبت بجز خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں نہ ہو۔ اہل اللہ نے تو جنت کی بھی رغبت نہیں کی۔

بعض صاحب حال کا حال

حضرت عمر بن الفارض رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جب انتقال ہونے لگا تو آٹھوں جنتیں ان کے سامنے کردی گئیں۔ انہوں نے منہ پھیر لیا اور یہ شعر پڑھا:

ان کان منلزتی فی الحب عندکم ما قد رایت فقد ضیعت ایامی (۲)

فحجبت الجنان وتجلی لہ الرب تعالی وطار روحہ فرحا بہ

پس اسی وقت جنتیں چھپادی گئیں اور حق تعالیٰ کی خاص تجلی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی جان نکل گئی اور بالکل وہ حالت ہوگئی:

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست گویم آنکس کہ ربود ایں دل دیوانہ ما (۳)

اور جان نکلنے کے قریب تھی ؎

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن نہ دہم (۴)

واقعی عمر بن الفارض رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو یہ کر کے دکھلا دیا کہ بدون تجلی الٰہی

(۱) ''میں تہ خاک ہوگیا اپنے معشوقوں کی محبت باقی ہے'' (۲) ''اگر آپ کے نزدیک میری محبت کی یہی قدر ہے جو میں دیکھ رہا ہوں تو میں نے اپنے دن ہی ضائع کیے ساری عمریوں ہی برباد ہوگئی'' (۳) ''اگر منکر نکیر آکر مجھ سے سوال کریں کہو تمہارا رب کون ہے تو میں جواب دوں گا وہی ہے جو ہمارے دل دیوانہ کو لے گیا'' (۴) ''اگر ملک الموت میری جان لینے کو آجائے تو جب تک رخ انور نہ دیکھ لوں جان نکلنے نہ دوں گا''۔

کے جان ہی نہ دی جب ان حضرات کو جنت پر بھی توجہ نہیں ہوتی تو دوسروں کی طرف تو کیا التفات ہوگا مگر یہ تو صاحب حال تھے ان کو جنت سے منہ پھیرنے کا حق تھا۔

اہل نیاز کو ناز زیبا نہیں

ہم کو بدون اس حال کے ایسا دعویٰ نہ چاہیے ہم کو تو اگر وہاں دنیا کی روٹی بھی مل جائے تو غنیمت ہے بعض لوگ اکثر ڈینگیں مارا کرتے ہیں کہ ہم کو جنت کی کیا پروا ہے، ہم کو حوروں کی کیا پروا ہے، یہ نہایت سخت بات ہے ہر شخص کا منہ اس بات کے قابل نہیں۔

ناز را روئے بیاید ہمچو ورد چوں نداری گرد بدخوائی مگرد
زشت باشد روئے نازیبا و ناز عیب باشد چشم نا بینا و باز(۱)

اور

پیش یوسف نازش وخوبی مکن جز نیاز و آہ یعقوبی مکن
چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش ہمچو او باگر یہ آشوب باش(۲)

غرض ہم لوگ اہل نیاز ہیں ہم کو ناز نہ چاہیے بلکہ احتیاج ظاہر کرنا چاہیے جو لوگ جنت سے لاپروائی کی ڈینگیں مارتے ہیں ان کو چار دن روٹی نہ ملے تو حقیقت کھل جائے اسی وقت لوگوں سے قرض ادھار یا خیرات مانگنے لگیں تو جس کی چار روٹیوں سے بھی استغناء نہ ہو اس کو جنت سے لاپروائی کا دعویٰ کب زیبا ہے۔ خیر وہ تو صاحب حال تھے مگر ہے یہی بات کہ محبت مرتے دم تک بلکہ مرنے کے بعد بھی دل سے نہیں نکلتی اس لیے اہل اللہ جائز محبت سے بھی بچتے ہیں ہم اگر ایسا نہ کرسکیں تو کم از کم حرام محبت سے تو بچنا چاہیے۔ اس واقعہ سے یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ حق تعالیٰ کے چاہنے والوں کی یہ حالت ہوا کرتی ہے کہ وہ مرتے وقت بجز جمال محبوب کے اور کسی خیال میں نہیں ہوتے واقعی جینا اور مرنا ان ہی کا کام ہے اور اگر ہم بھی ان کے ساتھ وابستہ ہوجائیں تو ان شاء

(۱) ''ناز کے لیے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے بدخوئی کے پاس مت جاؤ بدصورت کو ناز کرنا برا ہے، آنکھ اندھی ہو اور کھلی ہو عیب میں شمار ہوتی ہے'' (۲) ''یوسف علیہ السلام کے سامنے ناز اور اپنی خوبی مت بیان کرو سوائے نیاز اور آہ یعقوبی کے کچھ مت کہو۔ جب تم یوسف علیہ السلام نہیں ہو تو یعقوب علیہ السلام جیسے بنوان کی طرح سے گریہ وزاری کرو''۔

اللہ تعالیٰ دولت ہم کو بھی حاصل ہو جائے گی اور ہم بھی مرتے وقت ایسے ہی ہوں گے لیکن اگر یہ بات نہ ہو تو ایسا ہونا چاہیے کہ اس وقت کوئی ناجائز محبت دل میں نہ ہو اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ زندگی میں محبت حرام سے بچو! اگر زندگی میں اس میں مبتلا ہو گیا تو مرتے وقت بھی وہ ساتھ رہے گی۔ غرض عشق خواہ حلال ہو یا حرام دل سے کبھی نہیں نکل سکتا اسی لیے ہرقل نے کہا تھا کہ ایمان دل میں رچ جانے کے بعد نہیں نکلا کرتا کیونکہ ایمان نام ہے عشق خداوندی کا۔ چنانچہ نص ''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ''(۱) اس کی کافی دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کو بھول جانا کافر کا کام ہے

پس حاصل یہ ہے آیت میں تشبیہ(۲) کے اختیار کرنے کے دوسرے نکتہ کا یعنی چونکہ مخاطب مسلمان ہیں اس لیے وہ خطاب ''وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ''(۳) کے محل نہیں ہو سکتے یعنی وہ کبھی خدا کو دل سے بالکل بھلا نہیں سکتے۔ اس واسطے حق تعالیٰ نے: ''وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ''(۴) فرمایا اور اس میں بہ نسبت نکتہ اولیٰ کے زیادہ مبالغہ ہوا (کیونکہ اس نکتہ اولیٰ کا حاصل یہ تھا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا بعید سہی لیکن بھول سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے پھر بھی عنایت وشفقت کی بنا پر یہ نہیں فرمایا کہ تم ہم کو نہ بھولنا بلکہ یہ فرمایا کہ بھولنے والوں کی طرح نہ ہونا اور دوسرے نکتہ کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا ممکن ہی نہیں کیونکہ بالکل بھول جانا کافر کا کام ہے اور مسلمان کافر نہیں ہو سکتا) آگے ارشاد ہے: ''فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ'' کہ جب وہ خدا کو بھول گئے تو خدا تعالیٰ نے ان کے نفسوں کو بھی ان کو بھلا دیا۔ یہاں ایک نکتہ ہے گو ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا مگر خیر دل میں آئی ہوئی بات کو کیوں روکوں، شاید کسی کو نفع ہو جائے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے: ''وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ'' کہ ہم انسان کی جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں تو جو شخص جان سے زیادہ قریب کو بھول جائے تو یہ کیسے ممکن نہیں کہ وہ اپنے کو یاد رکھے۔ حقیقت میں خدا

(۱) ''اور مومن اللہ کی محبت میں سخت تر ہے'' (۲) بیان میں مثل کا جو لفظ اختیار کیا تھا اس کا دوسرا نکتہ یہ ہے (۳) ''تم ان لوگوں سے نہ ہونا جو خدا کو بھول گئے ہیں'' (۴) ''تم ان لوگوں سے نہ ہونا جو خدا کو بھول گئے ہیں''۔

کو بھولنے والا اپنے آپ کو بھی بھولا ہوا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے جو اپنے آپ کو بھی بھول گیا اس کو تو مقام فنا حاصل ہوا تو جواب یہ ہے کہ لعنت ہے ایسی فنا پر، فنا کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی یاد میں اتنا مستغرق ہو کہ اپنے کو بھول جائے (۱) نہ یہ کہ خدا کو بھلا کر اپنے آپ کو بھولے اور اگر کوئی یہ کہے کہ خدا کو بھول کر ہم اپنے کو کہاں بھولتے ہیں، اپنی یاد تو پھر بھی رہتی ہے تو پہلے یہ سمجھو کہ یاد کے معنی کیا ہیں؟ یاد مطلوب وہ ہے جو نافع ہو اور جو محبت کے ساتھ ہو چنانچہ یہ محاورہ بھی تو ہے کہ دوستوں سے کہا کرتے ہیں کہ بھائی ہم کو یاد رکھنا اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ محبت کے ساتھ یاد رکھنا یہ کسی کا مطلب نہیں ہوتا کہ بس جس طرح سے بھی ہو یاد رکھنا خواہ روزانہ دو چار لپڑ ہی (۲) لگا دیا کرنا اور اگر وہ آ کر دو چار لپڑ لگا دیا کرے اور یہ کہے کہ تم نے یاد کرنے کو کہا تھا میں یاد ہی تو کرتا ہوں تو اس کو ہرگز یاد نہیں کہا جاسکتا۔ غرض محاورہ میں بھی محبت ہی کی یاد کو یاد کہتے ہیں۔ دشمن اور ضرر رسانی کی یاد کو یاد نہیں کہا کرتے۔ اب سمجھئے کہ جس وقت کسی نے اپنے خدا کو بھلا دیا تو اس نے اپنے تمام مصالح کو فوت کر دیا۔

اب اس کو یہ یاد نہیں رہا کہ میرے نفس کی فلاح (۳) کا طریقہ کیا ہے تو حقیقۃً وہ اپنے کو بھول گیا اور اب اس کو اپنی یاد ایسی ہوگی جیسے کوئی کسی کے روزانہ دو چار جوتے مار کر یہ کہے کہ میں تجھ کو یاد کرتا ہوں۔ غرض جو شخص خدا تعالیٰ کو بھولے گا وہ اپنے کو بھی ضرور بھول جائے گا۔ اسی طرح جو خدا کو یاد رکھے گا وہ اپنے کو بھی یاد رکھے گا مگر مستقلاً نہیں بلکہ اس طرح کہ میں خدا کی چیز ہوں خدا تعالیٰ کے ساتھ مجھے تعلق ہے اور جو کچھ میرے پاس ہے سب خدا کی امانت ہے وہ کسی چیز کو بلاواسطہ خدا تعالیٰ کے یاد نہ کرے گا بلکہ جیسے عاشق کو محبوب کی سب چیزیں یاد رہتی ہیں اور ان کی یاد حقیقت میں محبوب ہی کی یاد ہوتی ہے۔

خودکشی کے حرام ہونے کا راز

اسی طرح وہ اپنے کو بھی اور اپنی متعلقات کو بھی اسی حیثیت سے یاد کرتا ہے کہ

(۱) اور درحقیقت خدا کی یاد میں اپنے کو بھولنے والا واقع میں بھولنے والا نہیں ہے بلکہ اپنے کو یاد رکھنے والا ہے گو درجہ التفات میں بھولا ہوا ہے۔ چنانچہ یاد کے معنی معلوم کر کے ابھی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی (۲) تھپڑ ہی مار دیا کرنا (۳) نفس کی کامیابی کا۔

یہ سب محبوب ہی کی چیزیں ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جیسے بیل پالنا تھا اور بیل کی حفاظت ایک تو مالک کرتا ہے وہ تو اپنی چیز سمجھ کر اس کی حفاظت کرتا ہے اور ایک نوکر حفاظت کرتا ہے وہ اپنی چیز سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ دوسرے کی چیز سمجھ کر اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اہل اللہ اپنی ذات یا اپنے ہاتھ پاؤں اور تمام متعلقات کی حفاظت نوکر کی طرح کرتے ہیں مالک کی طرح نہیں کرتے ہم تو کھاتے ہیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اور وہ سرکاری مشین کی حفاظت کے لیے کھاتے ہیں اور یہاں سے ''لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ''(۱) کا راز بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے قتل نفس سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ یہ آپ کی جان انہی کی ملک ہے تمہاری ملک نہیں ہم سب خدا ہی کی چیزیں ہیں اس لیے انہوں نے اپنی چیزیں بدون اجازت کے تصرف کرنے سے منع فرمادیا۔ اسی مرتبہ میں حکم ہے: ''اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا''(۲)

پس کسی کو یہ حق نہیں کہ کوئی دوا بار دکھا کر نامرد ہوجائے (۳) یا آنکھوں میں گرم سلائی لگا کر اندھا ہوجائے۔ عارفین پر چونکہ یہ راز منکشف ہوگیا ہے (۴) اس لیے وہ اپنی جان کو سرکاری چیز سمجھ کر اس کی خوب حفاظت کرتے ہیں اور اسی نیت سے بعض دفعہ عمدہ غذا اور عمدہ لباس بھی استعمال کرتے ہیں لوگ اس کو تن پروری سمجھتے ہیں مگر نہیں وہ اس سے بہت دور ہیں لیکن

درنیا بدحال پختہ ہیچ خام بس سخن کوتاہ باید والسلام (۵)

لذائذ کے استعمال میں عارفین کی نیت

ایک دفعہ ہمارے حضرت حاجی صاحب (۶) قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ میاں اشرف علی پانی جب پیو خوب ٹھنڈا پینا کہ ہر بن مو (۷) سے الحمد للہ نکلے گا اور گرم پانی پینے میں زبان سے تو الحمد للہ کہو گے مگر دل شریک نہ ہوگا۔ (آپ نے دیکھا کہ لذائذ کے استعمال

(۱) ''اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو'' (۲) ''بلاشک جسم کا تجھ پر حق ہے اور تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے'' مسند احمد: ۶/۲۶۸ (۳) کوئی بہت ٹھنڈی دوا کھا کر اپنی مرادنہ قوت زائل کرلے (۴) کھل گیا (۵) ''ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو کوتاہ کرنا چاہیے'' (۶) حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (۷) بال بال سے الحمد للہ نکلے۔

میں عارفین کی کیا نیت ہوتی ہے۔ عام لوگ تو ٹھنڈا پانی اس غرض سے پیتے ہیں کہ مزا آئے گا پیاس کو تسکین ہوگی اور عارف اس لیے پیتا ہے کہ ہر بن مو سے حق تعالیٰ کی حمد نکلے گی

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا(۱)

اور اسی راز کے منکشف ہونے پر ایک بزرگ فرماتے ہیں:

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را تو دامنت گرفتہ بوسیم کشیدہ است(۲)

اپنی آنکھوں پر ناز کرتے ہیں کیونکہ اس نے سرکاری کام کیا ہے اس نے محبوب کے جمال کو دیکھا ہے (اور اسی سے محبوب کے کلام کو دیکھ کر تلاوت کی توفیق ہوئی ہے، اپنے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیتے ہیں مگر اسی سرکاری تعلق کی وجہ سے کہ ان سے نماز پڑھی۔ خدا کے راستہ میں چلنا نصیب ہوا اور بہت سے کام رضائے محبوب کے واسطے سے لیے گئے۔ اس لیے فرماتے ہیں کہ میں اپنے ان اعضاء پر جان دیتا ہوں اور ان کی قدر کرتا ہوں۔

محبوب کی طرف بری باتوں کی نسبت کرنا بے ادبی ہے

مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ میں مکہ معظّمہ میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا، لوگ ان کے منہ پر ان کی تعریف کر رہے تھے اور وہ خوش ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا یہ کیسے بزرگ ہیں جو اپنی تعریف سے مزے لے رہے ہیں ان کو اس خطرہ کی اطلاع ہوگئی (۳) فوراً جواب دیا کہ میری تعریف تھوڑی ہی ہے۔ میرے محبوب کی تعریف ہے کیونکہ ہمارا کمال سب ادھر سے ہی ہے، مصنوع کی تعریف حقیقت میں صانع کی تعریف ہے (۴) کہ اس نے کس خوبی سے اس چیز کو بنایا ہے اس لیے میں محبوب کی تعریف پر خوش ہو رہا ہوں وہ کہنے لگے کہ مجھے پھر خطرہ ہوا کہ جب یہی بات ہے تو میرا یہ خطرہ بھی محبوب ہی کی طرف (۵) سے تھا اس پر اتنی ناگواری کیوں ہوئی ان کو

(۱) ''دیکھ تو راستہ کا فرق کہاں سے کہاں تک ہے'' (۲) ''میں اپنی آنکھوں پر ناز کرتا ہوں کہ تیرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پاؤں پر فدا ہوں کہ تیری گلی تک پہنچے ہیں ہر دم اپنے ہاتھوں پر ہزاروں بوسے دیتا ہوں کہ تیرے دامن کو پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے'' (۳) ان کو میرا یہ وسوسہ منکشف ہوگیا تو فوراً کہا (۴) کسی چیز کی تعریف اصل میں اس کے بنانے والے کی تعریف ہے (۵) میرے دل میں ایک اور خیال آیا۔

اس پر بھی اطلاع ہوگئی، فرمایا محبوب کی طرف بری باتوں کی نسبت کرنا بے ادبی ہے اب تو میں بہت گھبرایا کہ یہاں تو دل کو سنبھال کر بیٹھنا چاہیے یہ تو ہر خطرے پر مطلع ہوجاتے ہیں۔ واقعی اہل اللہ کے پاس بیٹھ کر برے خیالات سے دل کی حفاظت کرنا چاہیے کیونکہ ان کو گاہے خطرات (۱) پر بھی اطلاع ہوجاتی ہے جس سے ان کو ایذا ہوتی ہے۔

پیش اہل دل نگہدارید دل تا نباشید از گمان بدخجل (۲)

اہل اللہ کی خدمت میں بیٹھنے کا ادب

بس اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اہل اللہ کے پاس بیٹھنا ہی نہ چاہیے تو سمجھ لیجئے کہ جن کو خطرات کی اطلاع ہوتی ہے ان کو اللہ تعالیٰ یہ بھی معلوم کرادیتا ہے کہ یہ اختیاری ہے اور یہ غیر اختیاری ہے اور وہ ایسے نہیں ہوتے کہ غیر اختیاری امور پر مواخذہ کریں اور نہ غیر اختیاری خطرات سے ان کو ایذا ہوتی ہے پس نگہدارید دل کے معنی ہیں کہ اختیاری خطرات سے ان کے پاس بیٹھ کر دل کی حفاظت کرو غرض واقع میں ہم اپنے نہیں ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے ہیں تو جو خدا کو یاد کرے گا وہ اپنے کو اس طرح یاد کرے گا کہ اس کی نظر اول خدا پر پڑے گی پھر اپنے پر (اور یہ التفات الی الغیر نہیں ہے) اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک حسین شخص کے گھر میں آئینہ رکھا ہو جس میں اس کی صورت نظر آرہی ہو اور ایک عاشق بھی وہاں بیٹھا ہوا ہے جو محبوب کی طرف رعب جمال کی وجہ سے نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا اس لیے وہ آئینے میں اس کی صورت دیکھ رہا ہے اور ایک دوسرا شخص ہے جو عاشق نہیں وہ بھی اس آئینہ کو دیکھ رہا ہے مگر اس نیت سے کہ دیکھوں یہ آئینہ جلی ہے یا چینی ہے تو یہ دونوں شخص آئینے کے دیکھنے میں شریک ہیں مگر دونوں کے دیکھنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں درمیان شان برزخ لا یبغیان (۳)

ظاہر میں دونوں یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں الگ الگ ہیں، عاشق کی نظر اول محبوب کی تصویر پر پڑے گی، تو تبعاً آئینہ پر بھی نظر ہے اور غیر عاشق کی

(۱) دل میں آنے والے خیالات کا بھی علم ہوجاتا ہے (۲) ''اہل دل کے روبرو دل کی نگہداشت کرو تاکہ بدگمانی سے شرمندہ نہ ہو'' (۳) ''بحر تلخ اور بحر شیریں برابر دونوں جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حال ہے جس کی وجہ باہم مختلط اور متشبہ نہیں ہونے پاتے''۔

نظر اول آئینہ پر پڑے گی گو تبعاً حسین کی تصویر پر بھی نظر پڑ جائے گی مگر اس کا مقصود حسین کی تصویر دیکھنا نہیں ہے بلکہ صرف آئینہ کی خوبی دیکھنا مدنظر ہے۔ اسی طرح عارف بھی مخلوقات کو دیکھتا ہے اور ہم بھی دیکھتے ہیں مگر بڑا فرق ہے۔ اس کی نظر اول خدا تعالیٰ پر پڑتی ہے پھر تبعاً مخلوق بھی اس کے سامنے ہے اور ہماری نظر اول مخلوق پر پڑتی ہے۔ گو تبعاً حق تعالیٰ کی قدرت وصنعت کا بھی خیال آجائے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رتبہ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رتبہ تو یہاں تک ہے کہ ان سے پوچھا گیا: ''هَلْ عَرِفْتَ رَبَّكَ بِمُحَمَّدٍ اَمْ عَرِفْتَ مُحَمَّدًا بِرَبِّكَ'' کہ آپ نے حق تعالیٰ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے پہچانا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے سے پہچانا تو فرمایا: ''عَرِفْتُ مُحَمَّدًا بِرَبِّیْ'' کہ میں نے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے پہچانا۔ اگر آج کوئی شخص یہ بات کہہ دے تو بس کفر ہو گیا، بجائے قدر کرنے کے غریب پر چار طرف سے کفر کے فتوے لگیں گے کیونکہ حقیقت شناس دنیا سے اُٹھ گئے۔ چنانچہ ایک شخص نے میرے ایک دوست سے کہا کہ تم جو توحید کے مضامین زیادہ بیان کرتے ہو (کہ حق تعالیٰ کے افعال میں نہ کسی ولی کو دخل ہے نہ نبی کو وہاں کوئی دخیل کار نہیں ہے وغیرہ وغیرہ) اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے تعظیمی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ توبہ توبہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم سے تھوڑا ہی روکتے ہیں بلکہ خدا کی توہین سے روکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ حق تعالیٰ کو گھٹا دو غور کر کے دیکھا جائے تو جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صفات الوہیت ثابت کرتے ہیں حقیقت میں وہ آپ کی بے تعظیمی کرتے ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ صفات الوہیت درجہ کمال میں تو آپ کے لیے ثابت کر نہیں سکتے لامحالہ درجہ نقصان میں ثابت کریں گے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناقص قرار دیا (نعوذ باللہ) اور ہم آپ کے لیے صفات الٰہی کو ثابت نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی نفی کر کے صرف صفات بشریہ اور کمالات نبوت کو آپ کے لیے کرتے ہیں اور ان میں سے ہر صفت کو درجہ کمال میں ثابت کرتے ہیں تو ہم آپ

کو بشر کامل ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامل کہتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہو گے تو ناقص خدا کہو گے اور ہم انسان کہتے ہیں مگر کامل انسان، تو بتلاؤ بے تعظیمی کس نے کی، بے ادب وہ ہے جو آپ کو ناقص کہے یا وہ جو کامل کہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے گھٹانا بھی بے ادبی ہے تو پھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیا کہئے گا جو یوں کہتے ہیں کہ میں نے اول خدا کو جانا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے خدا کو نہیں پہچانا۔ غرض یہ ثابت ہو گیا کہ عارف کی نظر اول خدا پر پڑتی ہے۔ پھر اپنے پر تو معلوم ہوا کہ خدا قریب ہے اور نفس دور ہے (اگر خدا تعالیٰ نفس سے قریب تر نہ ہوتے تو کسی کی نظر بھی اول ان پر نہ پڑسکتی) تو لازم آ گیا کہ جو خدا کو بھول گیا وہ اپنے نفس کو بھی بھول گیا۔ اسی کا بیان ہے: ''فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ''(۱)

ہماری بدحالی کا سبب

آگے فرماتے ہیں: ''اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ'' یہ ہے جز ومقصود جس سے مجھ کو بدحالی مذکور سابقاً کا علاج مستنبط کرنا ہے(۲)۔ ترجمہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہیں حکم سے نکل جانے والے اس میں اولئک اسم اشارہ ہے جس کے لیے فاسقون کا حکم ثابت کیا گیا ہے اور بلاغت کا قاعدہ ہے کہ اسم اشارہ میں مشارالیہ کا مع صفات مذکورہ کے اعادہ ہوتا ہے اور حکم کی بنا انہی صفات پر ہوتی ہے جو پہلے مذکور تھے اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ق وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔(۳) کی تفسیر میں مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے کہ اسم اشارہ سے اس جگہ یہ بات بتلائی گئی ہے کہ ہدایت وفلاح کا حکم صفات مذکورہ ایمان بالغیب واقامة الصلوٰة کتب منزله وانفاق مال وغیرہ پر مبنی ہے اور ان صفات کو حکم فلاح میں دخل ہے) اس قاعدے کی بنا پر یہاں بھی اولئک میں صفت نسیان کا اعادہ ہوگا جو پہلے ''اَلَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ'' جو لوگ اللہ کو بھل گئے ہیں۔ میں مذکور ہو چکی ہے اور حکم فسق کی بنا اسی صفت پر ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ آیت میں نسیان خدا پر

(۱) ''پس وہ نفسوں کو بھول گیا'' (۲) یہ آیت کا وہ مذکورہ جزء ہے جس سے اس بدحالی جس کا سابق میں ذکر کیا گیا ہے مجھے علاج مستنبط کرنا ہے (۳) ''یہی لوگ ہیں ہدایت پر جو ان کو اللہ کی جانب سے ملی اور یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے'' سورۂ بقرہ:۵۔

فسق کو مرتب کیا گیا ہے تو یہ سبب ہوا فسق (۱) کا یعنی حکم سے نکل جانے کا اور حکم سے نکل جانا یہی حقیقت ہے معصیت کی جس میں ہم مبتلا ہیں تو الحمد للہ آیت سے صاف طور پر سبب مرض کی تشخیص ہوگئی اور معلوم ہوگیا کہ ہماری بدحالی کا سبب یہ ہے کہ ہم خدا کو بھول گئے ہیں۔

مرض نسیان کا علاج ذکر اللہ ہے

اور طبعی قاعدہ ہے العلاج بالضد (علاج ضد کے ساتھ ہونا چاہیے اور نسیان کی ضد ذکر ہے تو معصیت کا علاج ذکر اللہ ہوا یا یوں کہئے کے ہر مرض کا علاج رفع سبب سے ہوتا ہے (۲) خواہ ضد کے ذریعے سے رفع کیا جائے یا مثل کے ذریعے (۳) سے مگر ازالہ مرض کے لیے رفع سبب (۴) سب کے نزدیک ضروری ہے) اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرض عصیاں کا سبب نسیان (۵) ہے تو اس کا علاج یہ ہوا کہ نسیان کو اٹھادو اور رفع نسیان مستلزم ہے وجود (۶) ذکر کو (کیونکہ ارتفاع نقیضین محال ہے تو حاصل پھر وہی ہوا کہ معصیت کا علاج خدا کو یاد رکھنا ہے۔ میں بیان کو مختصر کرتا ہوں اور ایک بہت بڑے مضمون کو تھوڑے لفظوں میں بیان کرتا ہوں۔ گو جی نہ بھرے مگر ان شاء اللہ تعالیٰ بقدر کفایت تسلی ہوجائے گی۔ ایک دوست کا خط آیا تھا کہ تمہارے جوابات سے جی نہیں بھرتا کیونکہ میں لمبے لمبے مضامین کا جواب دو چار سطروں میں دے دیتا ہوں تو میں نے لکھا کہ گو جی نہیں بھرتا مگر تسلی تو ہوجاتی ہے اور چند جملوں میں آپ کی سب باتوں کا کافی جواب تو ہوجاتا ہے۔ اس کا انہوں نے اقرار کیا میں نے کہا بس یہی کافی ہے جی بھرنے کی ضرورت نہیں (جس کو جی بھرنا ہو وہ پاس آکر رہے اگر میں خطوط میں مخاطب کے جی بھرنے کی کوشش کروں تو بس دن بھر میں دو چار خطوں کا جواب ہوا کرے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ روزانہ کی ڈاک اسی دن پوری ہوجائے آج کا کام کل پر نہ رہے کیونکہ اگلے دن پھر دوسری ڈاک آجاتی ہے اور یہ صورت تو مختصر ہی جوابات میں ہوسکتی ہے لیکن الحمد للہ میرے جوابات باوجود اختصار کے کافی ہوتے ہیں، کسی جز و سوال کا جواب رہ نہیں جاتا)

(۱) خدا تعالیٰ کا نسیان نافرمانی کا سبب ٹھہرا (۲) اس کے سبب کو دور کرنے سے ہوتا ہے (۳) چاہے اس کی ضد کا استحضار کیا جائے یا مثل کا (۴) مرض کو زائل کرنے کے لیے اس کے سبب کو زائل کرنا ضروری ہے (۵) گناہوں کے ارتکاب کا سبب بھول ہے (۶) بھول کو ختم کرنے کے لیے ذکر کا وجود ضروری ہے۔

اسی طرح اس وقت گو مضمون بڑا ہے اور مختصر بیان سے شاید جی نہ بھرے لیکن ان شاء اللہ تسلی ہوجائے گی۔ یہ تو معلوم ہو چکا کہ گناہ سے بچنے کا طریقہ خدا کو یاد کرنا ہے۔

اللہ کی یاد کے متعدد طرق

اب یہ بات رہی کہ یاد کیسے کرے تو سنئے یاد کے طریقے مختلف ہیں۔ ایک یاد ہوتی ہے محبت سے اور ایک ہوتی ہے خوف سے اور ایک ہوتی ہے حیا سے اور ان میں بھی پھر چند قسمیں ہیں کہ محبت ذات سے ہے یا ثواب سے اور خوف ذات کا ہے یا عقاب کا (اور حیا ذات سے ہے یا محسن کے احسان سے) اس میں لوگوں کے طبائع (۱) اور مذاق مختلف ہیں بعضے تو وہ ہیں جن پر محبت ذات غالب ہے اور صرف ذات حق کا عشق ان کے لیے ذکر پر باعث ہے وہ نہ جنت کے لیے ذکر کرتے ہیں نہ دوزخ سے بچنے کے لیے بلکہ محض رضائے محبوب کے لیے ذکر کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں:

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند (۲)

یہ تو خواص عارفین کی حالت ہے اور بعضے وہ ہیں جن کو ذکر کا ولولہ اسی سے اٹھتا کہ ہم کو اس عمل سے جنت ملے گی ان کے ذکر کا منشا ثواب ہے سو اس کا بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ گو بعض عارفین نے ان پر اعتراض کیا ہے کہ یہ لوگ خواہش پرست ہیں (۳)، مزدوروں کی طرح کام کرتے ہیں کہ عمل سے پہلے اجرت ٹھہرا لیتے ہیں۔ گویا خدا سے کہتے ہیں کہ ہم اس شرط پر ذکر کرتے ہیں کہ اس صلہ میں ہم کو جنت دی جائے مگر یہ معترض محقق نہیں ہے۔ میاں مقصود تو ذکر ہے وہ ہونا چاہیے کسی طرح ہو اگر اس شخص کو طلب ثواب کی نیت سے روکا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ذکر ہی سے رہ جائے گا اور اگر یہ اسی نیت سے ذکر کرتا رہا تو ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن وہ بھی ہوگا کہ اس کو ذات حق سے عشق ہوجائے گا۔ پھر اس کو بھی رضائے محبوب کے سوا کچھ مطلوب نہ رہے گا۔ پس یہ حالت بھی اچھی ہے بری نہیں۔ دیکھو گلستان (۴) کے پڑھنے والے دو طرح کے لڑکے ہیں ایک تو وہ

(۱) طبیعتیں (۲) ''تم بندگی مثل فقیروں کے مزدوری کی شرط سے مت کرو آقا خود بندہ پروری کی روش سے واقف ہے'' (۳) خواہشات کے بندے (۴) شیخ سعدیؒ کی ایک کتاب کا نام ہے۔

ہے جس کو خود گلستان میں لطف آتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو محض باپ کے اس کہنے سے پڑھتا ہے کہ گلستان پڑھتے رہو گے تو ہم تم کو روزانہ ایک آنہ دیا کریں گے۔ ہر چند کہ اس کی حالت پہلے سے کم درجہ کی ہے مگر کیا کوئی عاقل اس سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میاں اگر گلستان پڑھو تو خود ذاتی شوق سے پڑھو ورنہ ایک آنہ کے لالچ سے پڑھنا فضول ہے اس میں کیا فائدہ۔ ہرگز نہیں کیونکہ اس کا نتیجہ بجز محرومی علم کے کچھ نہیں بلکہ ہر شخص یہ کہے گا کہ جس طرح بھی ہو پڑھنا چاہئے۔ اسی طرح ایک دن تم کو خود مزہ آنے لگے گا پھر اس وقت یہ حالت ہوجائے گی کہ اگر باپ بھی کچھ نہ دے بلکہ یہ کہے کہ گلستان پڑھنا چھوڑ دے تو تم ہرگز اس کی بات نہ مانو گے پھر یہ قاعدہ ذکر میں کیوں نہیں جاری کیا جاتا اور جو لوگ ثواب کے لیے عمل کرتے ہیں ان پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کے ارشاد فرمودہ سب طریقے بڑھیا ہیں

جب خدا تعالیٰ نے خود جنت کی رغبت دلائی (اور اس میں رغبت کرنے کا امر بھی کیا ہے) چنانچہ ارشاد ہے: ''وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ'' (۱) تو اس کی رغبت سے ذکر کرنے میں کیا حرج ہے اور جو معترض گھٹیا حالت بتلاتا ہے وہ گویا خدا تعالیٰ پر اعتراض کرتا ہے کہ انہوں نے گھٹیا حالت کی رغبت دلائی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے حق تعالیٰ نے جتنے طریقے بتلائے ہیں سب بڑھیا ہیں ان میں گھٹیا کوئی نہیں۔ (یہ اور بات ہے کہ ایک رفیع ہو دوسرا ارفع پس (۲) ہر چند کہ محض رضائے محبوب کے لیے ذکر کرنا مقام ارفع (۳) ہے مگر طلب جنت کے لیے ذکر کرنا بھی رفیع حالت ہے (۴) گھٹیا اور ادنیٰ حالت نہیں خوب سمجھ لو) یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ اِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ۔ (۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی رغبت سے عمل کرنا سب سے ارفع حالت ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی حالت تھی تو سمجھ لیجئے کہ ارفع تو وہی حالت ہے کہ محض

(۱) ''اس میں چاہیے کہ رغبت کرنے والے رغبت کریں'' (۲) ایک بڑھیا ہو اور دوسرا اس سے بھی بڑھیا ہو (۳) بلند تر مقام ہے (۴) بڑھیا حالت ہے (۵) ''اے اللہ! میں آپ سے جنت مانگتا ہوں اور پھر وہ چیز مانگتا ہوں جو جنت سے نزدیک کرنے والی ہو قول و عمل''۔

رضائے محبوب کے لیے عمل کیا جائے۔ رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا سو اس کے متعلق وہ بات یاد کر لیجئے جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ عاشق کو محبوب کی چیزوں سے بھی محبت ہوا کرتی ہے۔ پس آپ کا جنت مانگنا ویسا نہیں ہے جیسا ہمارا مانگنا تو ہم جنت اس لیے مانگتے ہیں کہ وہاں ہم کو آرام ملے گا، حوریں ملیں گی، خوب مزے اڑیں گے۔ غرض ہم کو حظ نفس مطلوب ہے(۱) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اس بنا پر تھا کہ وہ خدا کی چیز ہے اور خدا تعالیٰ نے اس کے مانگنے کا امر فرمایا ہے۔ جب محبوب خود یہ چاہے کہ مجھ سے میری چیزیں بھی مانگو تو اس وقت مانگنا ہی موجب رضا ہے اس وقت استغناء مناسب نہیں۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں خاک برفرق قناعت بعد ازیں(۲)

اس لیے آپ نے جنت مانگی اور اس سے استغناء نہ برتا۔ عارف کامل خدا تعالیٰ کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغناء ظاہر نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ جنت سے جو کہ اجل النعم ہے(۳) ہاں کوئی ابن الفارض جیسا صاحب حال ہو تو وہ بلا سے استغناء ظاہر کر دے اور ایسے لوگ غلبہ حال سے معذور ہوں گے ورنہ معرفت کا مقتضاء یہی ہے کہ جیسے محبوب سے رضائے محبوب طلب کی جاتی ہے اسی طرح اور جس چیز کا مانگنا اسے پسند ہو وہ بھی مانگے اور یہ بھی درحقیقت طلب رضا ہی ہے کسی دوسری چیز کی طلب نہیں۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت کا سوال اس بنا پر بھی کرتے تھے کہ وہ محل دیدار ہے تو درحقیقت یہ جنت کا سوال نہ تھا بلکہ دیدار محبوب کا سوال تھا۔ اسی کو کہتے ہیں:

عاشقان جنت برائے دوست می دارند دوست(۴)

طلب جنت کی متعدد نیتیں

اور ایک بات اس سے بھی باریک ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ جنت کی طلب اس نیت سے بھی نہیں ہوتی کہ وہاں محبوب کا دیدار ہوگا بلکہ محض اس خیال سے تمنا کی جاتی

(۱) ہم نفس کی لذت کے طالب ہیں (۲) ''اگر سلطان دین مجھ سے طمع کی فرمائش کرے تو اس کے بعد قناعت کے سر پر خاک ڈال دوں گا'' (۳) سب سے بڑی نعمت ہے (۴) ''عاشقین جنت کو محبوب کی وجہ سے دوست رکھتے ہیں''۔

ہے کہ ہماری یہ شان تو کہاں جو دیدار کی تمنا کریں تو اگر جائے دیدار ہی کو دیکھ لیں تو بڑی قسمت ہے ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ لوگ بڑے حوصلے کے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ گنبد خضراء ہی ہمیں نظر آجائے۔

مرا از زلف تو موئے بسند است ہوس را رہ مدہ بوئے بسند است(۱)

تو بعض دفعہ غلبہ تواضع طلب جنت کا منشا ہوتا ہے کہ عاشق اپنے کو وصال محبوب کے قابل نہیں سمجھتا اس لیے تمنا کرتا ہے کہ میں اس کو دیکھنے کے تو لائق نہیں۔ کاش اس کے شہر میں جارہا ہوں اور بھی اپنی احتیاج وافتقار(۲) ظاہر کرنے کے لیے جنت کی تمنا کی جاتی ہے کہ اے اللہ میں آپ کی رضا کا محتاج تو کیوں نہ ہوں گا میں تو جنت تک کا بھی محتاج ہوں اس لیے بطور اظہار احتیاج کے دعا کی جاتی ہے کہ اے اللہ جنت دے دے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال پیش نظر ہوتا تو آپ کھانا کھا کر فرمایا کرتے تھے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ غَیْرَ مُوَدَّعٍ وَلَا مَکْفُوْرٍ وَلَا مُسْتَغْنًی عَنْہُ رَبَّنَا۔(۳)

حقیقت میں آپ کی اداؤں کی یہ حالت ہے کہ

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست(۴)

آپ کی جس ادا کو بھی دیکھو اس میں غضب کی دل ربائی ہے۔ پھر کمال یہ کہ اس میں نہ تصنع(۵) نہ تکلف بلکہ ایک بے ساختہ حال ہے:

دلفریباں نباتی ہمہ زیور بستند دلبر ماست کہ باحسن خدا داد آمد(۶)

مخالفین نے بھی ان باتوں کو دیکھ کر آپ کی سچائی کی شہادت دی اور ان کو ماننا

(۱) ''اگر محبوب نہ ملے تو اس کا ایک بال ہی کافی ہے اور اگر بال بھی نہ ملے تو خوشبو ہی بہت ہے'' (۲) اپنی ضرورت اور فقر کے اظہار کے لیے (۳) ''یعنی اے اللہ! اس وقت پیٹ بھر گیا اس لیے کھانے کو ہٹا دیا ہے ہم اس کو ہمیشہ کے لیے وداع نہیں کرتے نہ اس کی ناقدری کرتے ہیں اور نہ اے اللہ ہمیں اس سے استغناء ہے'' سنن الترمذی: ۳۳۹۶ (۴) ''سر سے پیر تک جس جگہ نظر کرتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے یعنی اس کے حسن سے ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے'' (۵) بناوٹ اور تکلیف نہیں (۶) ''نباتی دلفریب زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں حسن خداداد ہے''۔

پڑا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جس قدر کمالات تھے وہ اصلی تھے تصنع اور بناوٹ کا وہاں نام نہ تھا۔ غرض ایک مبنیٰ طلب جنت کا یہ بھی ہوتا ہے یعنی اظہار احتیاج۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اور ہمارا مانگنا برابر نہیں (اور آپ کے سوال جنت کا یہ مطلب نہیں کہ عمل جنت کے واسطے کرنا چاہیے بلکہ اس کا جو منشاء آپ کی شان کے مناسب تھا وہ اپنے علم کے موافق کر دیا گیا ۱۲) لیکن اگر کوئی شخص جنت ملنے ہی کی نیت سے عمل کرے تو وہ بھی راہ صواب پر ہے(۱) غلط راستے پر نہیں خدا تعالیٰ سے محبت ہونی چاہیے خواہ بلاواسطہ براہ راست ہو یا جنت کے واسطے سب ٹھیک ہے:

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے شرف ور بکشم زہے طرب(۲)

یعنی مقصود قرب ہے بس قرب ہونا چاہیے خواہ میں انہیں کھینچ لوں یا وہ مجھے کھینچ لیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ مقصود تو کام چلنا ہے کہ بندہ کو خدا کی اطاعت وذکر کی توفیق ہوجائے۔ اب وہ براہ راست خدا کی محبت سے ہوا تو کیا اور جنت کی رغبت سے ہوا تو کیا دونوں راستے ٹھیک ہیں اور دونوں بڑھیا ہیں۔ گو ایک رفیع ہے اور ایک ارفع ۱۲(۳) یہ تو محبت کی قسمیں تھیں عظمت وجلالت شان کے اور کسی کو عذاب کا خوف ہے یہ دونوں راستے بھی ٹھیک ہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے اپنے عذاب وعقاب سے بندوں کو ڈرایا ہے اور اسکی شدت جابجا اسی لیے بیان فرمائی ہے کہ بعض طبائع پر جلالت وعظمت حق کا انکشاف نہیں(۴) ہوتا ان کے لیے خوف عذاب ہی گناہوں سے زاجر(۵) ہوتا ہے۔ پس جو لوگ خوف عذاب سے عمل کرتے ہیں ان پر بھی اعتراض نہ چاہیے ان کی حالت بھی گھٹیا نہیں (بلکہ رفیع حالت ہے(۶) گو اس سے ارفع کی یہ حالت ہے کہ عظمت وجلالت شان خالق منکشف ہوکر گناہوں سے زاجر ہو ۱۲)(۷)۔

(۱) ٹھیک راستہ پر ہے (۲) ''نصیبہ اگر مدد کرے تو محبوب کا دامن پکڑلوں، اگر وہ کھینچے بہت شرف ہے اور اگر میں کھینچوں بڑی خوشی'' (۳) ایک بلند ہے اور ایک بلند تر (۴) اللہ کی بزرگی اور عظمت شان منکشف نہیں ہوئی (۵) روکنے والا (۶) اچھی حالت ہے (۷) اگرچہ اس سے بہتر یہ حالت ہے کہ اللہ کی جلالت اور عظمت شان اس پر کھل جائے اور اس کے سبب گناہوں سے رکے۔

یاد کی اقسام

یاد کی دو قسمیں تو یہ ہوئیں ایک یاد محبت، ایک یاد خوف۔ ایک تیسری قسم اور ہے یاد حیاء بعض وہ طبائع ہیں جو ذکر اللہ اور اعمال صالحہ محض حیا کی وجہ سے کرتے ہیں ان کو اپنے خالق محبوب کی یاد سے غافل ہوتے ہوئے شرم وحیا آتی ہے خوف یا محبت ان کے لیے ذکر وطاعت کا قوی باعث (۱) نہیں ہوتا بلکہ وہ محض حیا کی وجہ سے سب کچھ کرتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حضرات خوف ومحبت سے خالی ہوتے ہیں یہ نہیں بلکہ ان کا غلبہ نہیں ہوتا، غلبہ حیا کو ہوتا ہے باقی خوف ومحبت وحیا کسی سے بھی کوئی مسلمان خالی نہیں ہوسکتا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہر مسلمان میں ان کا موجود ہے۔ ہاں غلبہ کسی پر خوف کا ہے کسی پر محبت کا کسی پر حیا کا اور جس صفت کا جس میں غلبہ ہے وہی اس کے لیے اعمال کی طرف داعی ہوتی ہے (۲) کسی میں حیا غالب ہے تو یہی حیاء اس کے لیے ذکر اللہ کا باعث ہوتی ہے یہ راستہ بھی ٹھیک ہے (خدا تعالیٰ نے جس کے لیے جو راستہ مناسب سمجھا مقرر کر دیا)۔

سرکاری تقسیم

بندگی کے معنی یہ ہیں کہ اس پر راضی رہے اور اس کے خلاف کی تمنا نہ کرے امور غیر اختیاریہ موہوبہ غیر مکتسبہ میں خلاف کی تمنا مذموم ہے (۳)۔ چنانچہ ارشاد ہے: وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۴)۔ پس اے سالکین! جب تم کو معلوم ہوگیا کہ ذکر کی اتنی صورتیں ہیں اور یہ سب وصول الی المقصود (۵) کے لیے کافی ہیں تو ذکر وشغل کر کے اس کے متمنی نہ ہوا کرو کہ کاش ہم کو خوف حاصل ہوجاتا اور جب عرصہ تک ذکر کر کے وہ حاصل نہ ہوا تو افسوس کرنے لگے کہ ہائے ہم پر خوف غالب کیوں نہیں ہوتا۔ صاحب تم کو کیا خبر ہے کہ تمہارے لیے خوف کا راستہ مناسب ہے یا محبت وحیا کا۔ یہ تو سرکاری تقسیم ہے جس کے مناسب جو راستہ معلوم ہوا اسی کے اسباب

(۱) بڑا سبب (۲) اعمال کرنے کا باعث ہوتی ہے (۳) غیر اختیاری اعمال میں جو صورت عطاء کی جائے اس کے خلاف کی تمنا درست نہیں کیونکہ اس میں کسب کو دخل نہیں (۴) ''مت تمنا کرو اس چیز کی جس سے اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے'' سورۃ النساء:۳۲ (۵) مقصود تک پہنچنے کے لیے۔

اس میں پیدا کر دیئے وہ کسی کو ہنسا کر پہنچاتے ہیں کسی کو رُلا کر اور کسی کو نہ ہنساتے ہیں نہ رُلاتے ہیں اس کو حیرت و پریشانی میں رکھ کر پہنچاتے ہیں۔ خوب کہا ہے:

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است بعند لیب چہ فرمودہ کہ نالاں است (۱)

مولانا فرماتے ہیں:

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست وربجہل آئیم ماز ندان اوست
گر بخواب آئیم مستان وسیم وربہ بیداری بدستان وئیم (۲)

اور حیرت کا بیان فرماتے ہیں:

در تردد ہرکہ او آشفتہ است حق بگوش او معما گفتہ است (۳)
کہ چنیں بنماید و گہ ضد ایں جز کہ حیرانی نباشد کار دیں (۴)
من چو کلکم درمیان اصبعین نیستم در صفت طاعت بین بین (۵)

یعنی جس طرح قلم کاتب کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہے وہی لکھا جاتا ہے، اگر عربی لکھنا چاہے تو قلم سے عربی ہی لکھی جاتی ہے اگر اردو لکھنی چاہے تو اردو ہی لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح تم بھی خدا تعالیٰ کی تقسیم کے سامنے مطیع ومنقاد ہوجاؤ (۶)۔ چنانچہ جنہوں نے اس کو سمجھ لیا ہے وہ ہر حال میں راضی رہتے ہیں۔ اگر ان پر محبت کا غلبہ ہے تو غلبہ خوف کے طالب نہیں ہوتے۔ اگر خوف کا غلبہ ہے تو غلبہ محبت کے طالب نہیں ہوتے وہ تو ہر حال میں یہ کہتے ہیں:

بدرد وصاف ترا حکم نیست دم درکش کہ انچہ ساقی ماریخت عین الطاف است (۷)

(۱) ''گل سے کیا کہہ دیا ہے کہ خندا ہورہا ہے اور بلبل سے کیا فرمادیا ہے کہ نالاں ہے'' (۲) ''یعنی اگر علم تک ہماری رسائی ہوجائے تو یہ بھی ان کا ایوان ہے کہ درجہ علم ان کے تصرف سے عطا ہوا اور اگر جہل میں مبتلا رہیں تو یہ ان کا زندان ہے یعنی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے۔ اگر سو رہیں تو ان ہی کے بیہوش کیے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو ہیں'' (۳) ''یعنی جو شخص تردد میں پریشان ہورہا ہے گویا حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ کہہ دیا ہے'' (۴) ''غرض کسی کو کچھ دیا کسی کو کچھ دیا جس کو محبوب کے ہاتھ سے جو بھی مل گیا اس کو سب سے اچھا سمجھنا چاہیے اور اس پر راضی رہ کر یہ شان ہونی چاہیے'' (۵) ''میں قلم کی طرح دو انگلیوں میں ہوں، صفت طاعت میں بین بین نہیں ہوں'' (۶) اطاعت گذار اور تابع رہو (۷) ''تجھ کو صاف اور گدلے سے مطلب نہیں خاموش رہ کر جو کچھ ہمارے ساقی نے پیالہ میں ڈال دیا ہے عین اس کی مہربانی ہے''۔

کیفیات ومقامات کی تمنا خلاف عبدیت ہے

یہ بات ذاکرین کے کام کی ہے کیونکہ ان کو بڑی حرصیں ہوتی ہیں ان میں حالات و کیفیات ومقامات کی تمنا کا مرض بہت ہے۔ یاد رکھو یہ خلاف عبدیت ہے بعض ذاکرین ذکر کرکے یہ شکایت کرتے ہیں کہ مزہ نہیں آتا ہائے یہ ساری عمر نفس کے مزے ہی میں پڑے رہیں گے، محبوب کی طرف کب متوجہ ہوں گے۔ حضرت منصور نے ایک سالک سے پوچھا کہ آج کل کس کام میں ہو، انہوں نے کہا کہ مقام توکل طے کررہا ہوں، منصور نے کہا افسوس تم ساری عمر پیٹ ہی کے دھندے میں رہو گے، محبوب کے ساتھ کب مشغول ہوگے کیونکہ واقعی توکل تو اکثر کھانے پینے اور پہننے ہی کے فکر سے چھوٹ جانے کے لیے کیا جاتا ہے تو یہ بھی پیٹ ہی کا دھندا ہوا ۱۲) یاد رکھو عاشق کا مذہب یہ ہونا چاہیے۔

عشق آن شعلہ است کہ چوں برفروخت ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لادر قتل براند در نگر آخر کہ بعد لاچہ ماند
ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت(۱)

جب لا الہ الا اللہ کہہ دیا تو اللہ تعالیٰ کے سوا سب منفی ہوگئے۔ پس اب نہ کسی خاص کیفیت کے طالب بنو نہ کسی خاص مقام کے بلکہ خدا کے طالب بنو اور اگر کچھ بھی نہ ملے تب بھی راضی رہو۔

گر مرادت را مذاق شکر است بے مرادی نے مراد دلبراست

یعنی ہم نے مانا کہ تمہاری مراد بہت عمدہ ہے مگر یہ تو سوچو کہ اگر دلبر کی مراد یہ ہے کہ تم نامراد رہو تو کیا اس کی مراد تمہاری مراد سے افضل نہ ہوگی۔ یقیناً ہوگی اس جگہ نامرادی کا مطلب اور کچھ نہ ملنے کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری مخترعات اور متخیلات (۲) نہ ملیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ بالکل کچھ نہ ملے کچھ تو ضرور ملتا ہے اگر تمہارے مخترعات نہ

(۱) ''عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو سوائے محبوب کے سب کو فنا کردیتا ہے لا الٰہ الا اللہ کی تیغ غیر اللہ کو ہلاک کرنے میں چلاؤ لا الٰہ الا اللہ کے بعد دیکھو کیا رہ گیا یعنی الا اللہ باقی رہ گیا باقی تمام فنا ہوگیا، اے عشق شرکت سوز تجھ پہ آفریں کہ سوائے محبوب حقیقی کے تو نے سب کو فنا کردیا'' (۲) تمہاری منگھوت کیفیات اور خیالات۔

ملیں گے تو وہ خود تم کو ملیں گے اور جب وہ مل گئے پھر تو سب کچھ مل گیا:

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند وعیال و خانماں راچہ کند(۱)

گناہوں سے بچنے کی آسان تدبیر

پس بندے کا کام یہ ہے کہ خدا کی یاد میں لگے اور ذکر وفکر ہی کو مقصود سمجھے اور کسی کیفیت پر نظر نہ رکھے کیونکہ میں نے بتلادیا کہ ذکر کی مختلف صورتیں ہیں اور ذکر ان سب کو عام ہے۔ اب میں گناہوں سے بچنے کی ایک بہت آسان تدبیر بتلاتا ہوں جس پر ہر شخص کو عمل کرنا آسان ہو وہ یہ کہ گناہ تو خیر ہم سے بہت ہوتے ہی ہیں اور سب کا دفعۃً چھوٹ جانا ہر شخص سے آسان بھی نہیں مگر تم یہ کیا کرو کہ ایک وقت تنہائی کا مقرر کرلو اور اس میں خدا کی یاد کیا کرو مگر یاد ایسی ہو کہ زبان و دل دونوں اس میں شریک ہوں ورنہ وہ حالت ہوگی ؎

سبحہ برکف توبہ برلب دل پرازذوق گناہ معصیت راخندہ میں آید براستغفار ما(۲)

اور ایسی زبانی یاد جلدی مؤثر نہیں ہوتی یاد خدا جلدی رنگ لاتی ہے جو دل وزبان دونوں سے ہو تو صاحب میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ دن بھر کوئی گناہ نہ کرو، میں کہتا ہوں کہ اگر تم سے گناہ چھوٹ ہی نہیں سکتے تو خدا کے لیے اتنا کرو کہ ایک وقت گھنٹہ آدھ گھنٹہ یاد خدا کے واسطے مقرر کرلو لیکن جب اللہ کا نام لینے بیٹھو تو قصداً دل میں کچھ نہ لاؤ اور جو خود آجائے اسے آنے دو وہ تم کو کچھ مضر نہیں، دیکھو اگر ایک سرکاری آدمی پہرا پر کھڑا کیا گیا ہو کہ دربار میں کسی باغی کو نہ آنے دے تو اگر وہ سنتری خود ہی باغی کو اندر لے لے تو مجرم ہوگا۔ لیکن اگر وہ خود اندر نہ لے بلکہ باغی اس کو مجبور کرکے اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر زبردستی اندر چلا آئے تو سنتری مجرم نہ ہوگا۔ اسی طرح نماز یا ذکر میں خود وساوس کا لانا یا ادھر مشغول ہوجانا برا ہے اور اگر خود نہ لاؤ اور نہ ادھر متوجہ ہو تو کچھ ضرر نہیں پس تم اپنے

(۱) ''جس شخص کو آپ کی معرفت حاصل ہوگئی اس کو جان فرزند واسباب کی پروا نہیں'' (۲) ''تسبیح ہاتھ میں اور لب پر توبہ اور دل گناہوں سے بھرا ہوا ہمارے استغفار پر گناہ کو ہنسی آتی ہے''۔

مایہ ومتاع(۱) کو خود ذہن میں نہ لاؤ بلکہ اپنی طرف سے تو اس کی کوشش کرو ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے بے ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روزہائے ہوئے(۲)

صاحبو! ایک گھنٹہ تو ایسا نکال لو جس میں اس طرح خدا کو یاد کرو۔ آگے ایک تجربے کی بات ہے کہ اس وقت جتنا مفرد اور بسیط ذکر ہوگا اتنا ہی یکسوئی زیادہ ہوگی اور وہی زیادہ مفید ہوگا۔ پس اس ایک گھنٹہ میں دل لگا کر لا الہ الا اللہ کا ذکر کرو یا اللہ اللہ اور اس وقت اپنی طرف سے خدا کی طرف متوجہ رہنے کی پوری کوشش کرو بس تم اس طرح روزانہ ایک گھنٹہ پورا کر دیا کرو اس کے بعد چاہے جس حال میں بھی تمہاری گزرے میں دکھلا دوں گا کہ چند روز کے بعد عین گناہ کے وقت شرم آئے گی اور گناہ کرتے ہوئے اندر سے کوئی چیز تم کو روکے گی اگر اس وقت تم نے اس شرم وحیا سے کام لیا اور فائدہ اٹھایا تو مدعا حاصل ہوگا اور اگر نفس وشیطان سے مغلوب ہو کر گناہ کر بھی لیا تو فوراً دل کے نور میں کمی معلوم ہوگی جس سے گھبرا کر معاً توبہ کی طرف جھکو گے اور اگلے دن اس حرکت کے بعد خدا کا نام لیتے ہوئے نہایت شرم آئے گی اور سخت صدمہ ہوگا اور کیا کہوں کیا کیا پیش آئے گا آپ ورد کو پورا کرنا چاہیں گے اور گناہ کا خیال آپ کی زبان پکڑ لے گا۔ بس وہ حال ہوگا ؎

احب مناجاة الحبيب يا وجهه ولكن لسان المذنبين كليل(۳)

پابندی ذکر کی برکات

حضرات میں آپ کو عجیب بات بتلا رہا ہوں بخدا ذکر کی پابندی کے ساتھ اول تو آپ سے گناہ ہی نہیں صادر ہو سکتے اور اگر ہوئے بھی تو اس حالت سے ہوں گے کہ بعد میں دل پر آرے چلیں گے جس سے ان شاء اللہ تعالیٰ یہ اثر ہوگا کہ ایک ایک کر کے سب گناہ چھوٹ جائیں گے اور جس وقت کوئی لغزش (۴) ہوگی فوراً دل پر نشتر (۵) سا لگے گا اور توبہ کی توفیق ہوگی، بدون توبہ کے چین ہی نہ آئے گا۔ جایئے میں نے تو اتنا سہل

(۱) اپنے ساز وسامان کے بارے میں خود نہ سوچو (۲) ''ایک ساعت ایک لحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی داروگیر شاہی سے بہتر ہے'' (۳) ''محبوب کی پسندیدہ تر مناجات کے بہت سے طریقے ہیں لیکن گناہ گاروں کی زبان بیان کرنے سے قاصر ہے'' (۴) کوتاہی (۵) دل پر چھری چل جائے گی۔

نسخہ بتلایا جس سے زیادہ آسان کوئی نسخہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کسی سے یہ تدبیر نہ ہو سکے تو ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ''(۱) بس اس کے لیے کہا جائے گا ؎

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

خلاصہ وعظ

خلاصہ وعظ کا یہ ہوا کہ اس آیت میں ''اُلٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ''، ''نَسُوا اللّٰہَ'' پر مرتب کیا گیا ہے جس سے اس نسیان کا سبب فسق و معصیت ہونا ظاہر ہوا اور مرض کا سبب علاج کے ازالہ سے ہوتا ہے تو معصیت کا علاج ازالہ نسیان ہوا اور ازالہ نسیان ذکر سے ہوتا ہے اس لیے گناہوں سے بچنے کے واسطے ذکر اللہ لازم ہوا جس کی سہل تدبیر میں نے بتلادی۔ الحمد للہ اس آیت سے یہ عجیب مسئلہ نہایت آسانی سے مستنبط ہو گیا۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ اس کو مقبول فرمادیں اور آپ کو اس کا نفع عنایت فرمائیں۔ آمین۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقه سیدنا ومولانا محمدٍ وعلٰی اٰله واصحابه اجمعین برحمتك یاارحم الراحمین۔ فقط(۲)

(۱) ''ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں'' (۲) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو اس وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی
۸/۱۰/۲۰۱۸

اخبار الجامعۃ

محمد منیب صدیقی (ادارہ اشرف التحقیق - جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ)

1۔ گذشتہ ماہ حضرت قاری احمد میاں صاحب تھانوی دامت برکاتہم العالیہ (مہتمم جامعہ ہذا) کو ایران کے معروف مدرسہ دارالعلوم زاہدان نے مدعو کیا تھا جہاں 27، 28 نومبر کو حفظ وقراءات قرآن کا سترھواں مسابقہ منعقد ہوا بعد ازاں 29 نومبر کو بلوشستان وسستان کے مدارس کے حفظ قراءات کے اساتذہ کا سالانہ اجلاس بھی ہوا جہاں قاری صاحب دامت برکاتہم کے ہمراہ مجمع المدارس کے حفظ کے رئیس قاری محمد قاسم حسینی صاحب دامت برکاتہم نے شرکت فرمائی۔ دوران سفر دارالعلوم زاہدان کے بہت سے طلباء نے قاری صاحب سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ 30 نومبر کو قاری صاحب چابہار کے سفر پر روانہ ہوئے اور وہاں جمعہ پڑھایا اور رات کو نور مسجد میں تلاوت اور بیان فرمایا اور بعد ازاں حضرت قاری صاحب نے نوبندیان میں تجوید وقراءات کے لئے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی۔ ہفتہ کے دن ایران کے مرکز طبع ونشر القرآن میں طباعت مصاحف پر حکومت ایران کے ذمہ داران سے تفصیلی مذاکرہ عربی میں ہوا، حکومت کی جانب سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب مخطوط مصحف کا مطبوعہ نسخہ ہدیۃً پیش کیا گیا۔

یوں حضرت قاری صاحب کا یہ سفر بروز اتوار بتاریخ 2 دسمبر 2018 کو بلوچستان، ایران میں اختتام پذیر ہوا اور براستہ تہران آپ واپس پاکستان پہنچے۔ قاری صاحب کی واپسی پر دارالعلوم زاہدان کے شعبہ قراءات کے صدر جناب ضیاء الرحمٰن صحت صاحب نے قاری صاحب کے سفر کی کارگزاری اور کلمات تشکر بزبان فارسی ارسال کئے۔

2۔ رواں ماہ شیخ الحدیث حضرت مولانا مشرف علی تھانویؒ کے بڑے صاحبزادے جناب ڈاکٹر مولانا اشرف علی فاروقی صاحب جو کہ اس وقت جامعہ کے مدرس ہونے کے

علاوہ نائب مہتمم صاحب کے معاون خاص بھی ہیں ملیشیاء کے سفر پر ہیں۔ جہاں حلال فوڈ سرٹیفکیشن کے فروغ اور پاکستان میں معیارات کے قیام کے سلسلے میں چند اہم ملاقاتیں کرینگے۔

3۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا مشرف علی تھانویؒ نے جو خانقاہی اصلاحی دروس کی بنیاد رکھی تھی وہ الحمد للہ بدستور قائم ہے اور شیخ الحدیث حضرت مولانا مشرف علی تھانویؒ کے بعد یہ ذمہ داری حضرت ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی دامت برکاتہم (نائب مہتمم جامعہ ہذا) بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں اور حضرت کا یہ درس ہر اتوار شاہ جمال کالونی میں حاجی جہانگیر صاحب کی قیام گاہ پر ہوتا ہے۔

4۔ بحمد اللہ تعالیٰ جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ کے تمام طلباء جنہوں نے امتحانات میں شرکت کی تھی عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا، جن کا نتیجہ بھی آچکا ہے۔ اللہ رب العزت تمام طلباء کو مزید دنیاوی واخروی کامیابیاں نصیب کرے۔ آمین